جاں نثار اختر : شاعر جدید
(تحقیق و تنقید)
ڈاکٹر اسلام عشرت

جاں نثار اختر : شاعر جدید

(تحقیق و تنقید)

جاں نثار اختر : شاعر جدید

(تحقیق و تنقید)

ڈاکٹر اسلام عشرت

صدر شعبہ اردو، بی۔ ایس۔ کالج۔ داناپور، پٹنہ

ڈاکٹر اسلام عشرت (ہندوستان)

رفاقت علی شاہد (لاہور، پاکستان)

کتاب	:	جاں نثار اختر۔ شاعر جدید
مصنف	:	ڈاکٹر اسلام عشرت
پتہ	:	نیو کالونی۔ دیگھا گھاٹ۔ پٹنہ۔ ۱۱
اشاعت	:	۲۰۰۰ء
تعداد	:	۵۰۰
قیمت	:	۱۰۰ روپے
کمپوزنگ	:	ذہین کمپیوٹرس، نئی دہلی
مطبع	:	بھارت آفسیٹ پریس، دہلی
ناشر	:	دانش پبلی کیشنز، جی، ۹۵۔ پی۔ سی۔ کالونی۔ کنکر باغ۔ پٹنہ۔ ۲۰

تقسیم کار

موڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹ اے، گولا مارکیٹ، دریا گنج، دہلی

JAN NESAR AKHTAR- SHAIR -E- JADEED
(CRITICISM)
BY : DR. ISLAM ISHRAT
HEAD, DEPARTMENT OF URDU,
B.S. COLLEGE DANAPUR,
PATNA-12

2000
Rs. 100/-

انتساب

قبلۂ خسر محترم کلیم الدین شمس صاحب

کے نام

جن کی شخصیت ہم سب کے لیے سایہ دار شجر اور مینارۂ نور کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کی محبتیں، شفقتیں اور ہمدردیاں ہمارے ساتھ ہیں۔ ان کی سرپرستی ورہنمائی کارزارِ حیات میں ہمیں عزم و حوصلہ عطا کرتی ہے۔

فہرست

حرفے چند

پروفیسر علیم اللہ حالی

جاں نثار اختر کی پہلی پہچان تو ترقی پسند تحریک سے ان کی وابستگی کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے لیکن وہ اسی حلقے میں اسیر ہو کر نہیں رہے۔ یہ بات تو طے ہے کہ کوئی سچا اور اچھا فنکار کسی مخصوص نظریے کا پابند ہو کر نہیں رہ سکتا۔ میں جب یہ بات کہہ رہا ہوں تو اس کے یہ معنی نہیں لینے چاہئیں کہ وابستگی یا Commitment کی بنیاد پر اچھی شاعری نہیں ہو سکتی۔ میرا مطلب صرف یہ ہے کہ سیاسی، سماجی، تمدنی، تہذیبی یا مذہبی نظریات کی وابستگی کو جب تک شعر و ادب کی جمالیات کے ساتھ پیش نہ کیا جائے اس وقت تک ادب میں ان نظریات کی شرکت مستحسن نہیں بنتی۔ یہ بات بھی طے ہے کہ شاعری خود کوئی Athics کی حامل نہیں ہوتی۔ اگر شعری جمالیات کو شعری اقدار کا نام دے دیا جائے تو اور بات ہے، ورنہ سچ تو یہ ہے کہ قدریں تو زندگی کے اتار چڑھاؤ سے بنتی ہیں۔ شاعری کا کام آزادانہ فضا میں گاہے گاہے ان اقدار حیات کی طرف نشاندہی کرنا تو ہو سکتا ہے، لیکن یہ کبھی کسی ایک نظریے کی وکیل بن کر نہیں رہ سکتی۔ جب ایسا ہوتا ہے تو شاعری بھی کمزور ہونے لگتی ہے

اور شاید نظریے کی وکالت بھی پورے طور پر نہیں ہو پاتی۔

ترقی پسند قبیلے سے وابستہ ترقی پسند دور کے دو ممتاز شاعروں یعنی فیض احمد فیض اور جاں نثار اختر کی مثالیں سامنے رکھئے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان حضرات کی بہترین شعری کاوشیں بھی آزادانہ تخلیقی فضا پر اصرار کرتی ہیں۔ ان کی شاعری کے وہ حصے نسبتاً کمزور ہیں جہاں راست انداز میں نظریات سے وابستگی کو دہرایا گیا ہے کو بہ انداز دگر پیش کرنے کی اجازت دے سکتی ہے۔ چنانچہ فیض اور جاں نثار اختر کی مقبولیت کی بنیادی وجہ اس لچھمن ریکھا سے بار بار باہر آنے کی کوشش ہے جسے کٹر پنتھی ترقی پسندوں یا کمیونسٹوں نے اپنے قبیلے کے لوگوں کے لئے متعین کر رکھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج جب اردو میں ترقی پسند تحریک تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہو گئی ہے اور ایک نیا تخلیقی منظر نامہ سامنے آچکا ہے، تو ہم جاں نثار اختر کے تخلیقی مزاج کو سمجھنے اور انکی شعری جمالیات سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اچھی شاعری شراب کہن ہوتی ہے۔ یہ جتنی کہنہ ہوتی جاتی ہے اتنی ہی تیز تر ہوتی جاتی ہے۔ آج جاں نثار اختر کے کلام کی بازیافت کے سلسلے سے ان کے ذکر و فن پر کئی تحقیقی مقالے لکھے جا چکے ہیں، کئی کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ انہیں کوششوں میں ڈاکٹر اسلام عشرت کی پیش نظر کتاب "جاں نثار اختر: شاعر جدید" کو بھی شمار کرنا چاہئے۔ ڈاکٹر اسلام عشرت آج کی نسل کے ان چند اہم ارباب نقد و نظر میں شمار کئے جاتے ہیں جو ماضئ بعید اور ماضئ قریب کے ادبی اثاثے کی قدر بھی کرتے ہیں اور ان کے مطالعۂ جدید کے ذریعہ عہد حاضر میں تخلیق و تنقید کے کام کرنے والوں کا قبلہ بھی درست کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے جاں نثار اختر اور ان کے معاصرین کا تفصیلی مطالعہ کیا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے مثبت و منفی اثرات پر بھی ان کی نظر ہے۔ اور اسی لئے جاں نثار اختر کے فکر و فن کا جائزہ لیتے ہوئے وہ عام طور پر صحیح نتائج تک پہنچ پائے ہیں۔ اپنے موضوع کے بنیادی فکر کی ترتیب میں انہیں بمل کرشن اشک کے اس کلیے سے خاصی مدد ملی ہے کہ جاں نثار اختر ترقی پسند شاعر ہونے کے باوجود جدید شاعر ہیں۔ ڈاکٹر عشرت نے اس کتاب میں کہیں یہ لکھا ہے کہ جدید اردو شاعری

ترقی پسند شاعری کے بطن سے پیدا ہوئی ہے ان کے اس تصور پر بڑی تفصیلی گفتگو ہو سکتی ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس وقت اس بحث کا موقع نہیں ہے۔

ڈاکٹر اسلام عشرت نے محنت و جانفشانی سے جاں نثار اختر سے متعلق وافر مواد جمع کیے ہیں۔ ان کی شاعری کی روح تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے تجزیے بھی معیاری ہیں۔ وہ جاں نثار اختر کو ہمعصر شعری ماحول میں جس مرتبے پر رکھنا چاہتے تھے اس میں انہیں کامیابی ملی ہے۔ یہ فتوحات کسی تنقید نگار کے لئے قابل فخر ہوں یا نہ ہوں لائق اطمینان ضرور ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ڈاکٹر اسلام عشرت مستقبل میں بھی اہم علمی و تنقیدی کارنامہ پیش کریں گے۔

ڈاکٹر علیم اللہ حالی

پروفیسر و صدر شعبہ اردو

مگدھ یونی ورسٹی، بودھ گیا

معروضات

اسلام عشرت

مجھے ابتدا ہی سے جاں نثار اختر کی شاعری اور شخصیت سے دل چسپی رہی ہے۔ اس لیے کہ جدید شعرا میں جاں نثار اختر ہی ایسے شاعر ہیں۔ جن کی شاعری میں قدامت وجدت کا بے حد حسین اور دل کش امتزاج نمایاں ہے۔ وہ دوسرے جدید شعرا کی طرح جدیدیت کے سیلِ رواں میں نہیں بہے۔ وہ کبھی بے راہ روی کے شکار نہیں ہوئے۔ وہ خود کہتے ہیں:

ہر چند نیا ذہن دیا ہم نے غزل کو
دل ہے کہ مگر پاسِ روایات کرے ہے

میری اس تصنیف کے آیندہ صفحات جاں نثار اختر کے اس قول کی تصدیق کریں گے اور ان کے اس دعوئ کی دلیل پیش کریں گے۔ زیر نظر تصنیف میں راقم السطور نے چار ابواب قائم کیے ہیں۔ پہلے باب میں جاں نثار اختر کے تعارف کا ایک اجمالی جائزہ لیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں جدید شاعری کا ایک سرسری مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں جدید شعرا سے تقابل کر کے یہ تعین کرنے کی سعی کی ہے کہ جاں نثار اختر کا مرتبہ ومقام جدید شعرا

کی صف میں کیا ہے۔ چوتھے باب میں جاں نثار اختر کی شخصیت اور ان کے فن کا تفصیلی تنقیدی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

۱۹۷۵ء میں کشور سلطانہ صاحبہ نے جاں نثار اختر پر ایک تحقیقی مقالہ پیش کیا۔ جس پر جبل پور یونی ورسٹی نے انھیں ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری تفویض فرمائی۔ اور جو کتابی صورت میں "جاں نثار اختر: حیات وفن" کے عنوان سے شائع ہو کر منظر عام پر آگیا ہے، علاوہ ازیں ظفر ادیب کی ایک کتاب "جاں نثار اختر: شخصیت اور شاعری" بھی چھپ چکی ہے۔

جاں نثار اختر کی شاعری کے بے شمار جلوے محجوب رہ گئے تھے۔ ان کی نقاب کشائی کی ضرورت تھی۔ میں نے جرأت سے کام لے کر ان محجوب جلوؤں کی نقاب کشائی کی سعی کی ہے۔ میں اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہو سکا ہوں۔ اس کا فیصلہ قارئین ہی کر سکتے ہیں۔ اگر اس تصنیف میں کسی صاحب ذوق کو کچھ بھی حسن نظر آیا تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت کام آئی۔

میں جناب پروفیسر علیم اللہ حالی کا ممنون ہوں کہ انھوں نے اس پر مقدمہ لکھنے کی زحمت گوارہ فرمائی۔ میں اپنے شفیق ابی الحاج عبدالستار صاحب کا بھی شکر گذار ہوں کہ ان کا عملی تعاون ہمیشہ شامل حال رہا۔ میں برادر کلاں اکرام فرحت صاحب کا ذکر کرنا اس لئے ضروری سمجھتا ہوں کہ اس کتاب کی تیاری میں انہوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ میں اشرف النبی قیصر صاحب کو کیسے فراموش کردوں کہ آجکل ایسے مخلص انسان خال خال ہی ملتے ہیں۔ میں محبی ڈاکٹر ارتضیٰ کریم کا مشکور ہوں کہ انہی کی کوششوں سے یہ کتاب منظر عام پر آرہی ہے۔ اور آخر میں اپنی رفیقہ حیات کا اعتراف بہ قول شاعر۔

کوئی پھول سا ہاتھ کاندھے پہ تھا
مرے پاؤں شعلوں پہ چلتے رہے

ڈاکٹر اسلام عشرت

جاں نثار اختر

ایک تعارف

جاں نثار اختر کا نام سید جاں نثار اختر حسین رضوی تھا۔ اختر تخلص کرتے تھے۔ ان کی پیدائش ۸ر فروری ۱۹۱۴ء میں بمقام گوالیار ہوئی تھی۔ ان کے والد ماجد کا نام سید افتخار حسین رضوی تھا۔ وہ اردو کے ایک مایہ ناز شاعر تھے۔ شعر و سخن کی دنیا میں وہ مضطر خیر آبادی کے نام سے مشہور تھے۔ مضطر خیر آبادی نے اپنی شاعری پر ابتداً اپنے بڑے بھائی سے اصلاح لی۔ لیکن بعد میں وہ امیر مینائی کے شاگرد رشید ہو گئے۔ جاں نثار اختر کی پیدائش کے وقت ان کے پدر بزگوار ہائی کورٹ کے جج تھے۔ اختر کی ولادت کے موقع پر بڑا شاندار جشن منایا گیا تھا۔ اختر کا تعلق خیر آباد شہر (یوپی) کے اس خاندان سے تھا جو اپنے علم و فضل میں سب سے ممتاز تھا۔ ان کے دادا سید احمد حسین رسوا اور پردادا سید تفضّل حسین صاحبان بھی جیّد عالم اور شاعر تھے۔ جاں نثار اختر کی دادی صاحبہ بی بی سید النساء مولانا فضل حق کی صاحبزادی تھیں۔ جو نہایت ذی علم اور ہوش مند تھیں۔ وہ ایک اچھی شاعرہ بھی تھیں اور ان کا تخلص حرماں تھا۔ مولانا فضل حق خیر آبادی کا جنگ آزادی میں جو اہم رول رہا اسے کبھی بھی تاریخ

فراموش نہیں کر سکتی۔ ان کے نانا حافظ محمد حسین بسمل خیر آبادی مرزا اسداللہ خاں غالب کے شاگرد تھے اور نواب ابراہیم علی خاں والی ٹونک کے استاد بھی تھے۔

اختر کے والد اپنے خاندان میں سب سے زیادہ ذہین تھے۔ بسمل خیر آبادی کے انتقال پر ملال کے بعد مضطر خیر آبادی کو نواب صاحب ٹونک نے اپنا استاد مقرر کر لیا۔ مضطر صاحب ٹونک میں مختلف بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ آخر میں سول جج صدر ٹونک بنا دیے گئے بعد از آں ۱۹۰۴ء میں ان کا پہلے پہل گوالیار دربار کے وکیل کی حیثیت سے مقرر ہوا۔ پھر سپرنٹنڈنٹ کورٹ آف وارڈس (Superintendent Court of Wards) بنائے گئے۔ پھر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ (District Magistrate) ڈسٹرکٹ جج (District Judge) اور سیشن جج (Session Judge) مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۳ء تک وہ گوالیار میں مقیم رہے۔ وہاں سے سبک دوش ہونے کے بعد نواب نصراللہ خاں والی بھوپال نے انھیں اپنے پاس بلایا اور انھیں جوڈیشیل سکریٹری (Judicial Secretary) کے عہدہ جلیلہ پر فائز کیا۔ بھوپال کے نواب کے بعد اندور کے مہاراجہ ہولکر نے بھی انھیں عزت بخشی اور انھیں اپنے پرسنل اسٹاف (Personal Staff) میں شامل کر لیا۔ ریاست اندور میں ان کی ملازمت کا سلسلہ تاحیات جاری رہا۔ ۱۹۲۷ء میں ان کی وفات گوالیار میں ہوئی۔ اس لئے کہ جب اندور میں وہ سخت بیمار ہوئے تو علاج کی غرض سے گوالیار چلے گئے۔ مضطر خیر آبادی کو عربی، فارسی، اردو اور انگریزی پر پوری دسترس حاصل تھی۔۔ مزید بر آں ہندی زبان سے بھی انھیں اچھی خاصی واقفیت تھی۔ وہ ایک منفرد غزل گو کے علاوہ ایک کامیاب نظم نگار اور ایک اچھے نعت گو بھی تھے۔ ان کو فن موسیقی سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ مضطر صاحب نے اپنی ہندی شاعری میں نہ صرف یہ کہ ہندی الفاظ استعمال کیے بلکہ انھوں نے اپنی ہندی شاعری کا خاص موضوع مذہب اور ہندو کلچر کو بنایا۔ ہولی، ٹھمری، دوہا، سندیس، برھا اور ملھار وغیرہ سب کچھ ان کے ہندی کلام میں شامل ہیں جو میرے دعوے کی تصدیق کرتے ہیں۔

جاں نثار اختر جب تقریباً چودہ سال کے ہوئے تو ان کے والد محترم مضطر خیر آبادی داغ مفارقت دے گئے۔ بچے کچھے اثاثہ میں صرف دو پرانی کاریں اور ایک بڑی حویلی رہ گئی تھی۔ ایک ماں تھی اور ایک بہن۔ جاں نثار اختر اپنی والدہ کے اکلوتے بیٹے تھے۔ صورت و شکل کے بھی اچھے تھے۔ کتابی چہرہ چوڑا ماتھا، گندمی رنگ میانہ قد اور طبیعت کافی بھولی بھالی تھی۔ جب وہ بات کرتے تو بے حد نرمی سلیقے اور شائستگی سے۔ ان کی زلفوں میں اکثر بل رہا کرتا تھا۔ جب اعلی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے جاں نثار اختر علی گڑھ آئے تو وہاں ان کی ملاقات ایسے نوجوان شعراء ادباء سے ہوئی جو مستقبل قریب میں آسمان ادب پر درخشاں مہتاب و انجم بن کر ابھرنے والے تھے۔ میری مراد حیات اللہ انصاری، سعادت حسن منٹو، اختر حسین رائے پوری، خواجہ احمد عباس، علی سردار جعفری، مجاز لکھنوی، معین احسن جذبی اور شاہد لطیف وغیرہ سے ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم اے کرنے کے بعد ۱۹۴۰ء میں جاں نثار اختر "اردو ناول اور اس کا ارتقاء" کے موضوع پر تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی۔ نامکمل چھوڑ کر گوالیار واپس آگئے اور "وکٹوریہ کالج" میں لکچرر ہو گئے۔ زندگی بے خوف و خطر اور سکون پرور ماحول میں گزرتی رہی۔ ان کی شاعری بھی پرانی ڈگر پر چلتی رہی۔ کچھ ہی عرصہ بعد ۲۵/دسمبر ۱۹۴۳ء کو ان کی شادی ان کے عزیز دوست مجاز لکھنوی کی بہن صفیہ سے ہو گئی۔ صفیہ علی گڑھ یونیورسٹی میں ملازم تھیں اور یہ گوالیار کے کالج میں لکچرر۔۔۔ خدا کا فضل تھا کہ بیوی ملی تو ایسی جو ناز اٹھانے والی تھی۔ کچھ دنوں تک جاں نثار اختر کی حیات میں بہت سکون رہا۔

جاں نثار اختر ستمبر ۱۹۴۷ء میں فسادات کے دوران گوالیار کی لکچر شپ چھوڑ کر بھوپال چلے گئے۔ بھوپال میں مولانا سید رزمی نے جاں نثار اختر کی کافی مدد فرمائی۔ رزمی صاحب اس وقت محکمہ تعلیمات کے وزیر تھے۔ صفیہ پاکستان جانا چاہتی تھیں۔ وہ سوچتی تھیں کہ وہاں (پاکستان) جا کر دونوں کو (صفیہ اور جاں نثار اختر) اچھی ملازمت مل جائے گی۔

جس سے تمام معاشی بد حالی، اور مالی پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔ لیکن جاں نثار اس فیصلہ سے اتفاق نہیں کر سکے۔ اور یہی نہیں بلکہ جاں نثار نے صفیہ کو علی گڑھ کی ملازمت بھی چھوڑ نے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ کچھ دنوں کے بعد صفیہ نے علی گڑھ کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ اور وہ بھی بھوپال آ گئیں۔ پھر کچھ مدت کے بعد جاں نثار اختر کا تقرر حمیدیہ کالج، بھوپال میں اردو کے لکچرر کی حیثیت سے ہوا اور بعدہٗ سی کالج میں صفیہ کی بحالی بحیثیت اردو لکچرر عمل میں آئی۔ پھر یہ ضرورت پیش آئی کہ اس کالج میں اردو اور فارسی دونوں مضامین کا ایک صدر مقرر کیا جائے۔ لہذا جاں نثار اختر اور صفیہ دونوں نے اس عہدے کے لئے اپنی اپنی درخواستیں دیں۔ انٹرویو ہوا اور انٹرویو کے بعد جاں نثار اختر کو صدر شعبہ اردو و فارسی کے عہدے پر فائز کیا گیا۔ لیکن دو سال تک صدر اردو و فارسی کے عہدے پر مامور رہنے کے بعد انھیں اپنی ملازمت سے سبک دوش ہونا پڑا۔

جاں نثار اختر اس زمانے میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے صدر تھے۔ اس عہد میں اس انجمن کے متعلق یہ خیال تھا کہ یہ کمیونسٹ پارٹی کا ادبی محاذ ہے۔ چنانچہ حکومت کی نظر اس جماعت پر بہت گہری رہتی تھی۔ اس لئے سرکار کی جانب سے یہ پابندی عائد کر دی گئی تھی کہ جو لوگ اس جماعت کے سرپرست، یار کن ہوں گے۔ انھیں سرکاری عہدوں سے مستعفی ہونا پڑے گا، جاں نثار اختر کے لئے وہ وقت بڑا ہی کٹھن اور آزمائشوں کا تھا۔ ایک طرف انھیں اپنے خاندان اور اپنے بچوں کے مستقبل کو سنوار نے کی فکر لاحق تھی تو دوسری جانب وہ جماعت کا ساتھ دینا بھی اپنا فرض اولین سمجھتے تھے۔ چند روز تک وہ ذہنی انتشار و اضطراب میں مبتلا رہے۔ لیکن آخر میں انھوں نے ترک ملازمت کا فیصلہ کر لیا۔ انھوں نے اپنی ذاتی فلاح و بہبود کو اپنے عقائد و نظریات کے لئے قربان کر دیا۔ یعنی انھوں نے بھوپال کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور روزی روٹی کی تلاش میں ممبئی چلے گئے۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جاں نثار اختر بے حد خوددار انسان تھے۔ اور انھوں نے اشتراکیت کو اپنی شاعری میں فیشن سمجھ کر استعمال نہیں کیا تھا بلکہ اسے اپنا نظریہ حیات بنا لیا تھا، ممبئی جانے کے بعد ابتداً ایک ماہ

تک جاں نثار اختر نے عصمت چغتائی کے یہاں قیام کیا۔ جب وہ ممبئی دفعتاً تشریف لے گئے تو بھوپال میں لوگوں نے یہ قیاس آرائیاں شروع کر دیں کہ جاں نثار اختر اپنی اہلیہ صفیہ سے خفا ہو کر ممبئی کے لئے روانہ ہو گئے ہیں۔ صفیہ نے اس واقعہ کا تذکرہ یکم جنوری ۱۹۵۱ء کے خط میں یوں کیا ہے :

"دوسری طرف سارے شہر میں اس خبر کی بری طرح رسوائی ہو چکی ہے۔ معلوم ہوا ہے "ندیم" اس خبر کو دوبار مختلف طریقوں سے چھاپ چکا ہے بعض لوگ سوچتے ہیں کہ غالباً میرے اور تمہارے درمیان ان بن ہو گئی ہے۔ غرض کہ جتنی منہ اتنی باتیں، تمہاری ہنگامہ پسندی کی تسکین کا موقع اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے۔

اختر تمہاری محبت کی آنچ مجھے تو کندن بنا کر ہی چھوڑے گی۔ کردار کی پختگی کے سبق مجھے ملتے رہنے دو۔" [1]

۱۹۵۰ء میں جب جاں نثار اختر ممبئی تشریف لے گئے تو ان کے بچپن کے دوست شاہد لطیف نے کہا۔ "بھئی دیکھو اختر! فلم کا بازار ہے ٹھنڈا۔ یہاں چاہو تو یہاں رہو، کھانے میرے ساتھ کھاؤ۔ کام خود تلاش کرو۔" واقعی فلمی دنیا میں کام کرنا بڑا سخت مسئلہ ہوتا ہے۔ اول تو نوکری ہی نہیں ملتی اور اگر ملتی بھی ہے تو بہت کم آمدنی ہوتی ہے اور مشاہرہ وقت پر ملتا بھی نہیں ہے۔ جاں نثار اختر کو بھی ممبئی جانے کے بعد فلمی دنیا میں کام ملنے سے قبل کون کون سی صعوبتیں اور دشواریاں نہ جھیلنی پڑیں۔ جاں نثار اختر چونکہ خاموش پسند آدمی تھے اس لئے انھوں نے اپنی تکالیف اور مشکلات کا اظہار کبھی نہیں کیا۔ البتہ صفیہ کے خطوط سے ان ناگفتہ بہ حالات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ صفیہ نے ایک خط میں لکھا ہے کہ :

"تم نے استعفیٰ دے دیا۔ اچھا کیا۔ ایک طویل ذہنی کش مکش کا خاتمہ یوں ہی ممکن تھا۔ میری طبیعت کی کمزوری سمجھو یا کچھ بھی۔ میرے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا بہر حال تم نے اپنے عزم کا ثبوت دیا ہے اور سچ جانو میں تمہاری فوقیت کے احساس سے سر جھکا دینے پر تیار ہوں۔ تمہیں کل ہی پیسے روانہ کروں گی۔ تمہیں

---

[1] زیرِ لب (خطوط کا مجموعہ) از صفیہ اختر ص ۲۱-۲۰

اس طرف واقعتاً سخت تکلیف ہوگی۔ بے تکلف ہر ضرورت اور ہر پریشانی سے آگاہ کرتے رہو۔

بھوپال کے حالات ناگفتہ بہ ہیں۔ ہر ایک گھر کی تلاشی لی جارہی ہے اور مختلف لوگوں کو مختلف طریقے سے پریشان کیا جارہا ہے۔ میرے لئے ملازمت کی کوئی صورت ضرور سوچتے رہنا۔ میں ہر چھوٹی بڑی ملازمت کرنے کو تیار ہوں۔ مجھے تمہارے ساتھ رہ کر دکھ بھی سکھ معلوم ہوگا۔ ہاں کپڑوں کی تمہیں تکلیف ہوگی۔ دو پاجامے بے سلے میں نے رکھ دیئے تھے۔ وہ تم عصمت آپا کی بھانجیوں سے سلوالینا۔ شیروانی کل ہی منگواؤں گی اور تمہیں بھیج دوں گی۔"[۲]

جاں نثار اختر ممبئی میں بے رحم وقت و حالات سے دوچار ہو کر کبھی کبھی بے حد مایوس و مضمحل ہو جاتے تھے۔ صفیہ نے ۳/اپریل ۱۹۵۱ء کو بھوپال سے جو خط جاں نثار اختر کے نام لکھا ہے اس سے اختر کی اسی ذہنی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے:

"اختر میری جان!

دوپہر کو خط ملا تھا۔ اسی وقت جواب لکھنے بیٹھ گئی تھی پھر خط پوسٹ نہ ہو سکا۔ اب شام کو اسٹیشن بھجوا رہی ہوں۔ تمہاری شوریدہ سری سے سخت وسوسے ہو رہے ہیں۔ آؤ میری جانب دیکھو! پیارے ملائمیت سے۔ آج میں تمہارے دل میں بھی ایسے خیالات کا آنا برداشت نہ کروں گی، تمہاری زندگی، تمہاری تندرستی اور مسرتوں کی مجھے ضرورت ہے۔ میرے بچوں کو ضرورت ہے۔ تمہارے ادبی حلقے کو ضرورت ہے خود آج زندگی کی بڑھتی ہوئی تحریک کو ضرورت ہے۔ تم اس طرح جینے کے مفہوم کو بعض وقت محدود نہ کرلیا کرو۔ خود کے لئے نہیں، دوسروں کے لئے جیو۔ پھر غم پاس بھی نہ پھٹکے گا۔

آؤ مسکراؤ! میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر، بڑے آئے قاتل بننے والے میری امانت کے، تمہاری زندگی پر تمہارے علاوہ دوسروں کو اختیار حاصل ہے اسے بھول مت جایا کرو۔

اچھا کڑی باتیں سوچنا ترک اور اب ہنسی خوشی کی گفتگو شروع ہونی چاہیے۔ میں

۲/زیرِ لب (خطوط کا مجموعہ) از صفیہ اختر ص ۱۹۔۱۷

جانتی ہوں تم اداس ہو جاتے ہو، میں بھی ہو جاتی ہوں مگر آؤ حوصلہ نہ کھوئیں،
ہمت نہ ہاریں امیدیں رہیں، اور فتح مند، شکست ہماری ہو نہیں سکتی"[1]

تمہاری دوست ساتھی اور دلہن

صفو

صفیہ کے اس خط سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ جاں نثار اختر ممبئ میں جب بے روزگاری سے گھبرا گئے تو خودکشی کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ لیکن اس خط میں صفیہ نے ان کو بڑی ہمت واستقلال دلائی اور ایک بڑا اہم نکتہ بیان کیا کہ انسان خودکشی کرنے کی جانب تب راغب ہوتا ہے جب وہ جینے کے مفہوم کو محدود کرلیتا ہے۔ چنانچہ صفیہ کہتی ہیں "جو دوسروں کے لئے جیتا ہے غم اس کے پاس نہیں پھٹکتا" میرا خیال ہے کہ اگر جاں نثار اختر کو صفیہ جیسی عقل مند باشعور اور بلند حوصلے والی بیوی نہیں ملتی تو وہ شاید زندگی سے گھبرا کر خودکشی کر لیتے۔ مگر صفیہ ہی تھیں۔ جنھوں نے انھیں ہر نازک موقع پر سنبھالا۔

پھر کچھ حالات سازگار ہوئے۔ ادھر صفیہ کا تقرر دس جولائی ۱۹۵۰ء حمیدیہ کالج بھوپال میں صدر شعبہ اردو و فارسی کے عہدے پر ہو گیا اور ادھر جاں نثار اختر کو "شاہین پکچرز" میں فلمی گانے لکھنے کے لئے جگہ مل گئی۔ تنخواہ تین سو روپے ماہوار مقرر کی گئی۔ لیکن کچھ مدت کے بعد کمپنی کے بند ہو جانے کی وجہ سے جاں نثار کی ملازمت کا خاتمہ ہو گیا۔ مگر دریں اثناء کبھی کبھی مختلف فلموں میں تھوڑا بہت کام اختر کو مل جاتا تھا۔ اسی زمانے میں یکایک صفیہ بہت زیادہ علیل ہوگئیں اور علالت کے باعث وہ بھوپال چھوڑ کر لکھنو چلی گئیں۔ جہاں ان کا علاج ہوتا رہا۔ صفیہ ہمیشہ اختر کے پاس اپنی بیماری کا حال بھیجتی رہیں۔ جاں نثار اختر سے جو کچھ بن پڑتا وہ صفیہ کے پاس روپے منی آرڈر کے ذریعہ بھیج دیتے تا کہ صفیہ کا علاج پابندی سے چلتا رہے۔ لیکن صفیہ کے بلانے پر وہ لکھنو نہ جاسکے۔ یہاں تک کہ ۱۷ر جنوری ۱۹۵۳ء کو صفیہ اس دار فانی سے کوچ کر گئیں۔ اپنی موت سے قبل ۲۹ر دسمبر ۱۹۵۲ء کو جو خط صفیہ نے جاں نثار اختر کو لکھا وہ ان کا آخری خط ثابت ہوا۔

۱۔ زیر لب (خطوط کا مجموعہ) از صفیہ اختر ص ۱۸۸

"عزیز اختر! میری جان!

نظم ملی۔ تمہارا بہت پیارا تحفہ۔ سچ جانو میرے آنسو ہی تو چھلک پڑے۔ آج میں کتنی مغرور ہوں اور نازاں--- مجھے تمہاری محبت، ملائمیت، دوستی، شفقت، خلوص اور اعتماد سب کچھ تو حاصل رہا ہے۔ آج مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ میں نے تمہاری شاعری کو بھی جیت لیا ہے۔ اب مجھے اور کیا چاہیے؟

اختر آؤ! تم مجھے مرنے نہ دو۔ میں مرنا نہیں چاہتی البتہ میں تھک بہت گئی ہوں ساتھی! آؤ میں تمہارے زانوں پر سر رکھ کر ایک طویل نیند لے لوں۔ پھر تمہارا ساتھ دینے کے لئے اٹھ کھڑی ہوں گی۔ میرے بے شمار پیار تم پر نچھاور ہیں۔[1]

تمہاری اپنی۔ صفو

صفیہ کا جب یہ خط ملا تو جاں نثار اختر مضطرب ہو اٹھے اور انھوں نے قصد کر لیا کہ وہ لکھنو جلد ہی جائیں گے۔ اس وقت جاں نثار اختر فلم "ڈنکا" کے لئے گانے لکھ رہے تھے۔ نمی پروڈیوسر تھیں اور ایڈوانی اس کے ڈائریکٹر تھے۔ فلم انڈسٹریز کا ایسا قاعدہ ہے کہ پہلے گانے کی سچویشن (Situation) ڈسکس (Discuss) ہوتی ہے پھر میوزک ڈائریکٹر اس کی دھن بناتے ہیں اور تب نغمے لکھے جاتے ہیں۔ پھر جب گانے کا ریکارڈ تیار ہو جاتا ہے تو میوزک ڈائریکٹر (موسیقار) کا اور میوزیشین (Musicians) کا روپیہ ادا کیا جاتا ہے۔ بعد از آں شاعر کا نمبر آتا ہے اور شاعر کو گانے کی قیمت دے دی جاتی ہے۔ چنانچہ اختر یہی سوچ رہے تھے کہ گانے کا روپیہ ملے تو لکھنو چلے جائیں کہ اتنے میں ان کو یہ تار ملا کہ صفیہ کی حالت بہت نازک ہے۔ تار پانے کے بعد جاں نثار اختر حواس باختہ ہو گئے اور روپے کے لئے بھاگ دوڑ شروع کر دی۔ وہ پہلے ڈائریکٹر ایڈوانی کے پاس گئے انھوں نے کہا کہ آپ پروڈیوسر کے پاس جائیے اور جب پروڈیوسر کے پاس گئے تو پروڈیوسر نے یہ جواب دیا کہ تین چار دنوں میں روپے آپ کو مل جائیں گے۔ لیکن جاں نثار اختر نے جب تار دکھایا اور کہا کہ مجھے فوراً چلے جانا چاہیے اس لئے کہ میری بیوی صفیہ کی طبیعت ایک دم دگرگوں ہے تو نمی (پروڈیوسر) نے انھیں محض پچاس روپے دیئے۔ بہر حال وہ پچاس روپے ملتے ہی لکھنو

---

۱ زیرِ لب (خطوط کا مجموعہ) از صفیہ اختر ص ۳۱۲

کے لئے روانہ ہو گئے مگر جب جاں نثار اختر لکھنو پہنچے تو اس وقت تک صفیہ کو سپرد خاک کیا جاچکا تھا۔ اس حادثہ جانکاہ کا صدمہ جاں نثار کو اس قدر ہوا کہ انھوں نے لکھنو سے واپس ہوتے ہوتے ایک نظم بہ عنوان "خاک دل" کہہ ڈالی یہ ایک ایسی نظم ہے جس میں جاں نثار اختر کے احساس اور جذبات نے خون ٹپکایا ہے۔ پہلا بند ملاحظہ ہو:

لکھنو میرے وطن، میرے چمن زار وطن
تیرے گہوارۂ آغوش میں اے جان بہار
اپنی دنیائے حسیں دفن کئے جاتا ہوں
تو نے جس دل کو دھڑکنے کی ادا بخشی تھی
آج وہ دل بھی یہیں دفن کیے جاتا ہوں
لکھنو میرے وطن، میرے چمن زار وطن!

صفیہ کی موت کے بعد مزار پر جاکر اس کی موت سے متاثر ہو کر جاں نثار اختر نے ایک اور لازوال و بے نظیر نظم کی تخلیق کی۔ جس کا عنوان رکھا "خاموش آواز" اس میں جتنا کیف و اثر موجود ہے وہ قابل صد تحسین ہے۔ اس نظم میں شاعر اپنی محبوبہ (بیوی) سے مخاطب نہیں ہے بلکہ خود اس کی معشوقہ (بیوی) شاعر سے مخاطب ہے۔ دو بند ملاحظہ فرمایئے!

کتنے دن میں آئے ہو ساتھی
میرے سوتے بھاگ جگانے
مجھ سے الگ اس ایک برس میں
کیا کیا بیتی تم پہ نہ جانے
اچھا ساتھی! جاؤ سدھارو
اب کی اتنے دن نہ لگانا
پیاسی آنکھیں راہ تکیں گی
ساجن جلدی لوٹ کے آنا

صفیہ کی جدائی سے جاں نثار اختر پر غم و آلام کا ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ لیکن انھوں نے ان ناسازگار فضا و حالات کا مقابلہ عزم و حوصلہ سے کیا اور منزل تک پہنچنے کے لئے

سرگرم عمل ہوگئے جس کا انھوں نے اور صفیہ نے مل کر خواب دیکھا تھا۔ جاں نثار اختر نے اپنے ایک خط میں اس خیال کا اظہار یوں کیا ہے:

"صفیہ نے زندگی بھر میری جدوجہد میں ساتھ دیا ایک سچی رفیقہ اور بہادر ساتھی کی طرح اور آج بھی اس کی موت نے مجھے زندگی سے بے زار نہیں کیا ہے بلکہ زندگی کی جدوجہد کی اور قوت مجھے بخش دی ہے۔ جس منزل کا خواب ہم آج تک دیکھا۔ جس صبح کا انتظار ہم اب تک کرتے رہے۔ وہ منزل ضرور آئے گی۔ وہ صبح ضرور طلوع ہوگی۔ اگرچہ صفیہ اس صبح کو دیکھنے کے لئے زندہ نہ رہ سکی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ جب وہ صبح طلوع ہوگی۔ صفیہ اس میں ضرور مسکرائے گی۔"

لکھنو سے جاں نثار اختر، پھر ممبئی واپس ہوگئے جہاں انھیں اس بار فلم پروڈیوسر اے۔ آر۔ کاردار نے اپنے اسٹوڈیو میں پانچ سو روپے ماہانہ مشاہرہ پر بحال کیا۔۔ جاں نثار نے فلم "باپ رے باپ" کے نغمے لکھے تو ان کی ملاقات او۔ پی۔ نیر سے ہوئی۔ کیونکہ "باپ رے باپ" کے موسیقار او۔ پی۔ نیّر ہی تھے۔ اس کے بعد جاں نثار اختر فلمی دنیا سے باضابطہ طور پر وابستہ ہوگئے۔

صفیہ کی موت کے بعد بھی جاں نثار اختر کا تعلق بھوپال سے قائم رہا۔ اس لئے کہ وہ مشاعروں میں اکثر بھوپال جایا کرتے تھے۔ انہی دنوں بھوپال میں ان کی ملاقات خدیجہ ہارون سے ہوئی۔ خدیجہ ہارون جاں نثار کی شاعری سے پہلے ہی بے حد متاثر تھیں۔ ان کے اندر بے پناہ حسن بھی تھا اور سیرت و کردار بھی اعلیٰ تھا۔ لہذا جب دونوں نے ایک دوسرے کو قریب سے دیکھا تو جاں نثار بھی خدیجہ ہارون سے اثر قبول کیے بغیر نہیں رہ سکے۔ جاں نثار اختر کو یہ خیال آیا کہ صفیہ کی کمی خدیجہ سے قربت حاصل کرنے کے بعد دور ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ۱۷ ستمبر ۱۹۵۶ء کو جاں نثار اور خدیجہ نے شادی کر لی اور دونوں ازدواجی زندگی بہ حسن وخوبی گزارنے لگے خدیجہ ہارون خدیجہ اختر بن گئیں۔ خدیجہ کی پہلی شادی (جاں نثار اختر کے ساتھ ان کی دوسری شادی تھی) بھوپال کے ایک مشہور و ممتاز ہاکی کھلاڑی شمس اللطیف نام کے ایک شخص سے ہوئی تھی اور ان سے ایک لڑکا شاہد پیدا ہو چکا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں

شمس اللطیف صاحب تنہا پاکستان چلے گئے اور بہت دنوں تک انھوں نے خدیجہ ہارون کی کوئی خبر نہیں لی۔ پھر اسی درمیان خدیجہ اور جاں نثار اختر ایک دوسرے کے بے حد قریب آگئے۔ تب شمس اللطیف صاحب ہندوستان کچھ روز کے لئے آئے اور خدیجہ کو اپنے ہمراہ پاکستان لے جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ لیکن خدیجہ پاکستان جانے کو تیار نہیں ہوئیں اور شمس اللطیف سے عدالت کے توسط سے طلاق لے کر جاں نثار اختر کی زندگی میں داخل ہو گئیں۔ خدیجہ کے نام ایک نظم بہ عنوان "آج کی رات" جاں نثار اختر نے شادی کے فوراً بعد لکھی۔ ذیل کے چند اشعار اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ اختر کی زندگی میں صفیہ کی موت کے بعد دوسری شریک حیات گئی تھیں۔

ایک طغیان طرب ہے میرے کاشانے میں
اک صنم آہی گیا دل کے صنم خانے میں
شہر میں ایک قیامت تیرے اقدام سے ہے
آج کی رات تو منسوب ترے نام سے ہے

جاں نثار اختر کی دوسری سسرال بھی علم و فضل میں پہلی سسرال سے کم نہ تھی۔ خدیجہ کے والد محترم ہارون عرب کے دادا ممتاز عالم شیخ حسین عرب تھے جو نواب صدیق حسن خان کے اتالیق تھے۔ نانا قاضی زین العابدین صاحب شہر بھوپال کے قاضی تھے اور ان کا شمار حدیث کے ممتاز عالموں میں ہوتا تھا۔ ہارون میاں کے والد ماجد شیخ عبداللہ عرب تھے جو اپنے چاروں بھائی کی طرح علم کا بیش بہا خزانہ اپنے پاس رکھتے تھے۔ میاں ہارون کی والدہ بھوپال کے مشہور و معروف جاگیر دار میاں قاسم انصاری کی بہن تھیں۔ خدیجہ ہارون کی پیدائش ۱۹۲۷ء میں ہوئی جاں نثار نے خدیجہ سے تعلق قائم کرنے کے بعد چند شاہکار نظمیں لکھیں۔ مثلاً ایک نظم ۱۹۵۵ء کی ہے جب جاں نثار اختر "تال کے خوش نما حسین مناظر" والے خدیجہ کے شہر میں بار بار آتے تھے اور انھیں اس شہر کی زبوں حالی ستاتی تھی۔ "تمہارے شہر میں" کا انتساب خدیجہ کے نام ہے۔ جاں نثار اختر کو اس شہر سے اس قدر

والہانہ پیار اس لئے ہے کہ یہ شہر ان کی معشوقہ کا وطن ہے۔ جاں نثار اختر کی خواہش ہے کہ اس شہر کی صبح و شام بدلیں اور تیرگی کا سینہ چیر کر اجالا ہر سو پھیلے۔ وہ سوال کرتے ہیں۔

میں تم سے پوچھ رہا ہوں جواب دو مجھ کو
تمہارے شہر کو کیوں ظلمتوں نے گھیرا ہے
میں تم سے پوچھ رہا ہوں جواب دو مجھ کو
تمہارے شہر میں تم ہو تو کیوں اندھیرا ہے

دوسری نظم جاں نثار نے "خدیجہ کے نام" عنوان کے تحت سپرد قلم کی ہے۔ اس نظم میں اس خوشی اور سرشاری کا ذکر بڑی خوبی کے ساتھ کیا گیا ہے جو جاں نثار اختر کو خدیجہ اختر سے قرب حاصل کرنے کے بعد نصیب ہوئی۔ اس نظم کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جاں نثار اختر بھی خدیجہ کو دل اور روح کی گہرائیوں سے پیار کرتے ہیں۔

صفیہ کے انتقال کے بعد جاں نثار اختر ممبئی میں مستقل رہنے لگے تھے اور ان کو فلمی گیتوں کے ذریعے کافی آمدنی ہو جاتی تھی۔ یعنی ان کا اور صفیہ کا دونوں کا خواب پورا ہو گیا تھا یہ علاحدہ بات ہے کہ صفیہ کی زندگی میں دونوں کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ جاں نثار اختر دل کے مریض تھے۔ انھوں نے اپنی موت سے ایک ہفتہ قبل تک فلموں کے لئے گیت لکھے۔ ۱۸/اگست ۱۹۷۶ء کو ان پر اچانک دل کا دورہ پڑا۔ اور وہ ممبئی ہی کے "جسلوک ہسپتال" میں رحلت فرما گئے۔

جدید اردو شاعری

ایک سرسری جائزہ

جدید شاعری کی اصطلاح کیسی ہے! جدید شاعری کی تعریف کیا ہے! ہم جدید شاعری کسے کہہ سکتے ہیں ان تمام باتوں کی وضاحت اردو کے مشہور و ممتاز نقاد ڈاکٹر عبادت بریلوی کی درج ذیل عبارت سے بخوبی ہو جاتی ہے۔

"جدید شاعری بہ ظاہر ایک عجیب سی اصطلاح ہے کیوں کہ ہر زمانے کی شاعری جدید ہوتی ہے اس کو قدامت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ وہ اپنے زمانے کہ نئے احساس کی ترجمانی کرتی ہے۔ اس زمانے کی جذباتی اور ذہنی زندگی کے سارے خدوخال اس کے آئینے میں بے نقاب نظر آتے ہیں۔ کسی خاص زمانے کی شاعری کو جدید کیوں کہا جاتا ہے؟ درحقیقت جدید شاعری وہ شاعری ہے جو کسی انقلابی انداز سے بدلتے ہوئے ماحول کی صحیح ترجمانی میں خود اپنے آپ کو بدل دے اس کے لئے روایت سے تھوڑی سی بغاوت ضروری ہے تجربے کے ہاتھ کا بھی اس میں شامل ہونا یقینی ہے۔ جو شاعری روایت کی بنی ہوئی ڈگر سے تھوڑا سا ہٹ کر چلتی ہے اور جس کی رفتار میں تجربہ کا آہنگ ہوتا ہے۔ اس کو ادبی

اصطلاح میں جدید کہتے ہیں۔اور یہ صورت حال کسی خاص دور کی شاعری میں اس وقت پیدا ہوتی ہے جب احساس بدلتا ہے، زندگی کے نئے تقاضے جب نئے شعور کو پیدا کرتے ہیں جب سوچنے کے انداز میں تبدیلی ہوتی ہے جب غور کرنے کا آہنگ ایک نیا روپ اختیار کرتا ہے۔ جب نئے تصورات کے چراغ جلتے ہیں۔ نئے خیالات کی شمعیں فروزاں ہوتی ہیں نئے نقطۂ نظر کا آفتاب طلوع ہوتا ہے۔ نئے معیار بنتے ہیں نئی قدروں کی تشکیل ہوتی ہے اور ان حالات کے سائے میں زندگی اور ادب کا قافلہ نئی راہوں پر گامزن ہو جاتا ہے اس عالم میں شاعری ایک نیا روپ، ایک نیا انداز اور ایک نیا آہنگ اختیار کر لیتی ہے اسی کو جدید شاعری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔"

اب یہ دیکھئے کے جدید شاعری کا آغاز کب اور کیوں کر ہوا؟ ساتھ ہی ساتھ یہ دیکھنا ہے کہ جدید شاعری جس وقت جنم لے رہی تھی اس وقت کا ماحول کیسا تھا، فضا کیسی تھی اور حالات کے تقاضے کیا تھے؟ ہم جانتے ہیں کہ جب ۱۸۵۷ء میں ایک عظیم انقلاب رونما ہوا تو اس انقلاب کے نتیجہ میں زندگی نے بھی نئی کروٹ لی۔ نئے نئے حالات و مسائل سامنے آئے گویا ایک نئی دنیا کی تعمیر شروع ہوئی۔ ایک نئے نظام کا قیام عمل میں آیا۔ ایک نئی تہذیب نے جنم لیا، ایک نئے معاشرے کی نیو پڑی۔ زندگی کے تمام شعبوں میں نمایاں تبدیلی نظر آنے لگی اور ظاہر ہے کہ ان حالات میں ہماری شاعری اس تغیر و تبدل کو قبول کئے بغیر بھلا کیسے رہ سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری شاعری پر بھی اس انقلاب اور اس تبدیلی کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ شاعری کے موضوعات کو سب سے پہلے تبدیل کرنے کی کوشش کی گئی اور نئے نئے موضوعات پیش کرنے کے لئے نئے نئے فارمولے اور نئے نئے طریقے اپنائے گئے ان تبدیلیوں کی ایک جھلک ہمیں سب سے پہلے انجمن پنجاب کے زیر اہتمام ہونے والے مشاعروں میں دکھائی دیتی ہے اس انجمن کا قیام لاہور میں ہوا تھا۔ اس میں مولانا حالیؔ اور آزادؔ پیش پیش رہے تھے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا بیان ہے:

"اردو شعر و ادب کے تاریخ نگار عام طور پر جدید اردو شاعری کے دور کا

آغاز ۱۸۶۵ء میں لاہور میں انجمن پنجاب کے قیام سے کرتے ہیں۔ اس انجمن کے محرک اور مشہور رہنما ڈاکٹر جی۔ ڈبلو۔ لائٹرز تھے جو گورنمنٹ کالج لاہور اور اورینٹل کالج کے سربراہ کی حیثیت سے نیز بے شمار علمی اور لسانی تصانیف کی بنا پر ایک ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ اس انجمن کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ علوم مفیدہ کی اشاعت ہو اور ادبی اور سائنٹفک دلچسپی کے مضامین اور مباحث پر گفتگو ہو اور سماجی و سیاسی معاملات میں ملکی لوگوں کو آزادی کے ساتھ اظہار خیال کا موقع ملے۔ انجمن بڑی مقبول ہوئی اور پورے صوبے میں اس کی شاخیں قائم ہو گئیں۔ انجمن نے ایک عوامی دارالمطالعہ اور ایک عوامی کتب خانہ قائم کیا اور عام فہم تقریروں و مقامی شعراء کی شعر خوانی سے اس کی دلچسپیوں میں اضافہ ہوا۔ اس انجمن نے سماجی، صوبہ جاتی اور انتظامی اہمیت کے موضوعات پر بحث و مباحثہ میں ایک نمایاں حصہ لیا ہے۔"[1]

مندرجہ بالا عبارت کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ انجمن پنجاب کے قیام نے جدید شاعری کے لئے راستہ بالکل ہموار کر دیا۔ چنانچہ یہی سبب ہے کہ اس انجمن کے زیر اثر پروان چڑھنے والوں میں محمد حسین آزاد اور حالی کو نمایاں حیثیت حاصل ہے کیوں کہ اس عہد میں ان دونوں نے بعض اہم اور قابل قدر نظمیں لکھیں ۔ مثلاً آزاد کی مثنوی موسوم بہ "شب قدر" "مثنوی موسوم بہ "صبح امید" اور "حب وطن" وغیرہ اسی دور میں لکھی گئی ہیں اور حالی کی بعض نظمیں جیسے "برکھارت" "نشاط امید" اور "مناظرہ" رحم و کرم و انصاف" وغیرہ بھی اسی زمانے کی پیداوار ہیں۔ یہ نظمیں بلاشبہ اردو شاعری کے لئے نئی راہیں واکرتی ہیں۔ ان نظموں میں احساسات و شعور بھی نئے ہیں اور ان کے موضوعات بھی نئے، اسالیب بھی نئے --- لہذا اگر ہم یہ کہیں کہ ان نظموں کا مرتبہ آج بھی اردو کی جدید شاعری میں مسلم ہے تو یہ کوئی بے جا بات نہ ہو گی۔

یہ صحیح ہے کہ جدید شاعری کا آغاز لاہور میں ہوا لیکن اس نے اپنا ارتقائی سفر

۱۔ آج کا اردو ادب : ابو اللیث صدیقی، ص ۳۶۔۳۵

سر سید احمد خاں کی تحریک کے زیر اثر علی گڑھ اور دلی میں طے کیا۔ یا یوں کہیئے کہ سر سید تحریک کے سائے میں جدید شاعری نے باضابطہ طور پر شباب کی منزلیں طے کیں۔ حسن اتفاق سے جب حالی کو لاہور سے دلی منتقل ہونا پڑا تو دلی پہنچنے کے بعد حالی کو سر سید احمد خاں کی تحریک سے اتنی گہری دلچسپی ہو گئی کہ انھوں نے اپنی شاعری میں سر سید کے پیغامات کو بہت ہی زور و شور کے ساتھ پیش کرنا شروع کر دیا۔ بلکہ اگر ہم یہ کہیں کہ حالی نے دلی پہنچ کر اپنی شاعری سر سید کی تحریک اور اس کے مشن کے لئے وقف کر دی تو یہ کوئی نامناسب بات نہ ہو گی۔ چنانچہ اس زمانے کی بہترین یادگار حالی کی نظم "مد و جزر اسلام" ہے۔ جو ۱۸۷۹ء میں تکمیل تک پہنچی۔ حالی کی یہ مسدس اتنی مشہور و مقبول ہوئی کہ اس عہد کی بہت سی اصلاحی و اخلاقی کامیاب نظمیں بھی اس کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ بہر حال سر سید احمد خاں کی تحریک نے جدید اردو شاعری کے لئے سب سے پہلے راستہ ہموار کیا اس تحریک کے زیر اثر جدید طرز میں نئے نئے موضوعات پر نظمیں لکھنے کا رواج ہوا اور یہ بات درست ہے کہ حالی نے اس زمانے کے ماحول اور تقاضوں کی بھرپور عکاسی اپنی نظموں میں کی۔ ان کے یہاں جدت طرازی نمایاں ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی نظمیں جدید اردو شاعری میں ایک اہم اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

حالی کے ہم عصر دوستوں میں ایک نمایاں اور اہم نام اکبر الہ آبادی کا آتا ہے اگرچہ انھیں روایت پرستی اور قدامت پسندی بے حد عزیز تھی۔ لیکن اس کے باوجود ان کا شمار جدید شاعری کے علم برداروں میں ہوتا ہے۔ ان کے احساسات، خیالات اور تجربات نئے ہیں۔ ان کے سوچنے اور سمجھنے کا طریقہ بھی نیا ہے ان کے اشارے و کنایے نئے ہیں ان کی علامتیں نئی ہیں ان کی زبان اور انداز بیان بھی نیا ہے گویا وہ ایک نئے لب و لہجہ کے خالق معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ اسی بنا پر اگر ہم بھی دوسروں کی طرح یہ کہیں کہ وہ اپنے دور کے ایک اہم جدید شاعر تھے تو یہ غلط نہ ہو گا وہ اپنے دور کے سب سے بڑے نکتہ چیں تھے۔ لیکن ان کی نکتہ چینی میں تعمیر کا پہلو غالب ہے اور اسی تعمیری پہلو کو پیش کرنے کے لئے انھوں نے طنز و ظرافت

کا سہارا لیا ہے جسے بہ خوبی نبھایا بھی ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ اکبر اپنے طرز و انداز کے موجد بھی تھے اور خاتم بھی۔ اس لئے کہ انھوں نے اپنی شاعری کے لئے جو نیا رنگ اور اچھوتا اسلوب انتخاب کیا تھا وہ انھیں پر ختم ہو گیا۔

حالیؔ اور اکبرؔ کے معاصرین میں شبلیؔ نعمانی اور مولوی اسمٰعیل میرٹھی کے اسمائے گرامی بھی قابل ذکر ہیں بلاشبہ جدید اردو شاعری پر ان کے بھی کافی احسانات ہیں۔ البتہ یہ بات صحیح ہے کہ شبلی سے زیادہ اسمٰعیل میرٹھی نے اردو شاعری کو جدید تقاضوں سے روشناس کرایا جو ان کا بڑا کارنامہ ہے۔ شبلی نے اردو شاعری کی جانب بہت کم توجہ دی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے محض چند نظمیں لکھنے پر اکتفا کیا۔ تاہم ان کی نظموں میں بھی جدت طرازی ملتی ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ ان کی نظمیں حالی اور اکبر کی نظموں کے پایے کی نہیں ہیں۔ برخلاف اس کے اسمٰعیل میرٹھی کی نظموں میں ہئیت کے نئے تجربے ملتے ہیں اور انسانی مسائل سے متعلق موضوعات بھی۔ مثلاً قومی، سیاسی، سماجی، وطنی، ثقافتی اور اخلاقی اقدار کو بھی انھوں نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے اور اسی وجہ سے وہ جدید شاعروں میں ایک ممتاز مقام کے حامل ہیں۔ لیکن ان کے ہاں حالی کی سی شدت احساس اور جذب و شوق نہیں ملتا پھر بھی اسماعیل میرٹھی اور شبلی کو جدید شاعری کی تاریخ فراموش نہیں کر سکتی۔ جدید شاعری کی جس تحریک کی داغ بیل سرسید احمد خاں، حالیؔ، آزاد اور ان کے دوسرے معاصرین نے ڈالی تھی وہ انیسویں صدی کے اواخر تک ایک اہم تحریک کی شکل میں تبدیل ہو گئی۔ اس دور میں جو نظمیں لکھی گئیں وہ جدید طرز اور جدید انداز میں۔ اس عہد کی نظموں میں سماجی و سیاسی حالات کی عکاسی اور مناظر فطرت کی مصوری اپنے عروج پر دکھائی دیتی ہے لیکن ان نظموں میں انقلابی رنگ و آہنگ بالکل مفقود ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانے میں اصلاحی رجحان غالب تھا اور ان حالات میں انقلاب کی بات بے معنی معلوم ہوتی ہے اور غالباً یہی وہ اصل سبب ہے جس کی بنا پر اس زمانے کی نظموں میں ہئیت کے کوئی تجربے نہیں کیے گئے اور صنف مثنوی اور مسدس کی ہئیت و روپ ہی کو کافی سمجھا گیا۔ بہر حال ان

باتوں کو نظر انداز اس لئے کیا جا سکتا ہے کہ جدید شاعری کے لئے وہ دور بچپن کا تھا۔ جدید شاعری کی جوانی کا عہد تو دراصل بیسویں صدی سے شروع ہوتا ہے۔

جدید شاعری جب انیسویں صدی کا عہد ختم کر کے بیسویں صدی کے عہد میں اپنا قدم رکھتی ہے تو یہاں اسے کافی وسعتیں مل جاتی ہیں۔ جدید شاعری کو بیسویں صدی کے اوائل میں پنڈت برج نرائن چکبست اور سر ڈاکٹر محمد اقبال جیسے شعراء مل جاتے ہیں۔ ان دونوں شعرا نے جدید شاعری کے چمن میں ہزاروں نئے نئے قسم کے گل بوٹے کھلائے ہیں اور جدید شاعری کے الجھے ہوئے گیسوؤں کو اپنے ہاتھوں سے سنوارا ہے۔ چکبست کی شاعری میں وطنیت کا جذبہ غالب نظر آتا ہے۔ لیکن ان کی شاعری میں انقلابی رنگ و انداز نہیں ہے۔ تاہم ان کی بعض نظمیں ان کے دور کی بھرپور نمایندگی کرنے میں کامیاب ہیں۔ اس لئے ان کی نظموں کا درجہ و مرتبہ ان کے پیشتر شعرا کی نظموں سے بلند معلوم ہوتا ہے۔ چکبست کے بعد اقبال کا نمبر آتا ہے۔ اقبال کئی جہتوں سے چکبست کے مقابلے میں بلند و بالا مقام پر فائز نظر آتے ہیں۔ مثلاً اقبال کے یہاں چکسبت سے زیادہ سیاسی شعور بھی ہے اور انقلابی آہنگ بھی۔۔۔ علاوہ ازیں اقبال مسلمانان اسلام کے مصائب و آلام اور ان کی زبوں حالی سے بے حد متاثر ہوئے اور متاثر ہو کر "تصویر درد" "طلوع اسلام" "شکوہ وجواب شکوہ" اور "شمع و شاعر" وغیرہ جیسی نظمیں لکھیں۔ ان کے یہاں فکر و فلسفہ کے عناصر نمایاں ہیں۔ گویا اقبال نے جدید شاعری کی بنیادوں کو شعوری طور پر بہت مضبوط بنانے کی کوشش کی ہے اور اسی لئے میں نے سطور بالا میں کہا ہے کہ چکبست کے آگے اقبال نے اپنا مقام بنالیا ہے کیوں کہ چکبست کی شاعری میں اقبال کی جملہ خصوصیات نہیں ملتیں۔

اقبال اور چکبست کا زمانہ میرے خیال میں جدید شاعری کے لئے سب سے زیادہ موزوں اور بہتر تھا۔ ان دونوں شعرا کے بعد چند اور ایسے شعرا جدید شاعری کے میدان میں آئے جنھوں نے اردو شاعری میں جدت پسندی کی اس روایت کو آگے بڑھایا۔ ان میں مولانا ظفر علی خاں، بے نظیر شاہ، شوق قدوائی اور مسرور جہاں آبادی وغیرہم کے اسمائے گرامی

قابل ذکر ہیں۔ ان سبھوں نے سیاسی، سماجی، تہذیبی، ملکی اور قومی جیسے تمام اہم مسائل پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ مناظر قدرت کی منظر کشی بھی کی ہے مگر یہ لوگ اقبال اور چکبست کے مقام تک نہیں پہنچ سکے۔ بہر حال اس کے باوجود جدید شاعری کے ارتقا کی تاریخ میں ان کے نام ہمیشہ ادب اور احترام کے ساتھ لیے جائیں گے۔ اقبال اور چکبست کے علاوہ ان کے جن دیگر ہم عصروں نے اردو شاعری کو جدت سے ہمکنار کرنے میں تعاون دیا۔ ان میں جوش ملیح آبادی صفی لکھنوی، سیماب اکبر آبادی، حامد اللہ افسر، حفیظ جالندھری، ساغر نظامی، روش صدیقی اور اثر صہبائی وغیرہ کے اہم نام شامل ہیں۔ ان سبھوں نے اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق اردو میں جدید طرز کی نظمیں لکھیں اور اپنی نظموں میں ہئیت کے تجربات اور نئے نئے موضوعات بھی پیش کیے ہیں۔

بلاشبہ چکبست، اقبال اور جوش نے جدید شاعری کا ایک صحیح ماحول بنایا اور انہی کے فیض کا یہ اثر ہے کہ ان کے معاصرین شعرا میں بعض نے اپنی شاعری کے ذریعہ جدید اردو شاعری کی بنیادوں کو استحکام بخشا۔ اختر شیرانی، حفیظ جالندھری، حامد اللہ افسر، احسان دانش، روش صدیقی، ساغر نظامی، اور الطاف مشہدی وغیرہ کا یہاں ذکر کرنا نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ ان سب نے مل کر وطنیت کا ایک واضح تصور پیش کیا اور اپنے اپنے طور پر دامان اردو شاعری کو وسیع تر کرنے کی سعی کی ہے۔ مثلاً اختر شیرانی کے کلام میں عشق کا شدید احساس پایا جاتا ہے۔ لیکن وہ عشق کے تمام لوازمات سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ ان صبر آزما مصائب و حالات سے بالکل گھبرا جاتے ہیں، جن کا عشق کو اکثر و بیشتر سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یعنی وہ ایک عاشق ضرور ہیں مگر ان کا اقدام اناڑی عاشق کا ہوتا ہے۔ تاہم یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ عشقیہ جذبات و احساسات پر مشتمل انھوں نے بعض اچھی نظمیں بھی کہی ہیں۔ حفیظ جالندھری بھی حسن و عشق کے شاعر ہیں۔ گویا ان کا بھی موضوع خاص وہی ہے جو اختر شیرانی کا رہا ہے۔ انھوں نے جدید اردو شاعری کو تین حسین نعمتیں عطا کی ہیں۔ پہلی نعمت وطن کی محبت ہے، دوسری زندگی سے گہری رغبت اور تیسری آزادی سے

نسبت۔ مگر ان کے کلام میں صحیح سماجی وسیاسی شعور کی کمی ہے۔ اس لئے کہ سیاسی اور سماجی معاملات و مسائل پر انھوں نے جو نظمیں لکھیں ہیں۔ ان میں جذبات کی فراوانی پائی جاتی ہے۔ احسان دانش نے اپنی شاعری کا موضوع انقلاب اور بغاوت کو بنایا ہے۔ انھوں نے پس ماندہ اور مزدور طبقے کی زندگی کا عبرت ناک نقشہ نہایت خوبی کے ساتھ کھینچا ہے اور لوگوں کو انقلاب و بغاوت کا علم بلند کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ پسماندہ طبقے کا استحصال نہ ہو، بلکہ اس طبقے کو دوسرے لوگوں کی طرح جینے کا حق دیا جائے۔ روش صدیقی نے اپنی نظموں میں مختلف قسم کے موضوعات کو پیش کیا ہے۔ ان کی شاعری میں مشرق کی آزادی کی لہریں اٹھتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ ان کے کلام میں فطری و قدرتی مناظر کی دل فریبیاں، رعنائیاں اور جلوہ سامانیاں بھی ملتی ہیں۔ حامد اللہ افسر بے حد جذباتی شاعر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی وطن دوستی پر جذباتی عناصر غالب ہیں مگر اس کے باوجود انھوں نے بعض کافی اہم اور حسین نظموں کی تخلیق کی ہے۔ جن کے باعث جدید اردو شاعری انھیں فراموش کرنے سے قاصر ہے۔ ساغر نظامی اور الطاف مشہدی بھی وطن دوست اور وطن پرست شعرا ہیں۔ لیکن ان دونوں کے یہاں سماجی وسیاسی بالیدگی نہیں ملتی۔ وہ زندگی کی بنیادی قدروں پر روشنی نہیں ڈالتے، بلکہ سیدھے سادے اور چھوٹے موٹے موضوعات کو اپناتے ہیں۔ عام موضوعات پر انھوں نے اچھی نظمیں لکھیں ہیں۔ غرضیکہ تمام شعرا نے جن کا ذکر گذشتہ صفحات میں کیا گیا جدید اردو شاعری کو فروغ دینے میں نمایاں حصہ لیا ہے اور بلاشبہ اقبال اور چکبست نے جدید اردو شاعری کا جو پودا لگایا تھا اسے ایک تناور درخت بنانے میں ان سبھوں نے مل کر اہم رول انجام دیا۔

۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۵ء تک کا عہد ہمارے ملک میں نہایت خلفشار اضطراب اور سیاسی کش مکش کا عہد مانا جاتا ہے اس لئے کہ اس زمانے میں سیاسی اور سماجی شعور میں کافی ترقیاں ہوئیں۔ جذباتیت کا دور ختم ہو گیا اور اس کی جگہ عقل و شعور نے لے لیا۔ انقلاب کے تصورات بھی عام ہونے لگے۔ زندگی کو نئے سانچے اور نئے قالب میں ڈھالا جانے لگا اور پامال

انسانی اقدار کی اہمیت وافادیت سمجھی جانے لگی اور انہی حالات میں جدید شاعری نے بھی اپنا چولا بدلا جس کے نتیجے میں نیا لب ولہجہ اور نیا رنگ و آہنگ اختیار کیا گیا، اس لب ولہجے اور اس رنگ و آہنگ کا ساتھ دینے والے شعرا میں مخدوم محی الدین، معین احسن جذبی، اسرار الحق مجاز، فیض احمد فیض، علی سردار جعفری، علی جواد زیدی، جاں نثار اختر، احمد ندیم قاسمی، ساحر لدھیانوی اور سلام مچھلی شہری وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان شعرا نے اپنے اپنے دائرہ میں اپنی صلاحیتوں کے مطابق حیات و کائنات کی تشریح و تفسیر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مخدوم کے یہاں گہرے سماجی شعور اور انقلاب کا احساس ہوتا ہے۔ چونکہ جذبی ایک غزل گو ہیں اس لئے ان کی نظموں میں غنائی کیفیت پائی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں ان کے یہاں سماجی زندگی کے مختلف عناصر کی کارفرمائی بھی ملتی ہے۔ مجاز کا شمار بنیادی طور پر رومانی شعرا میں ہوتا ہے لیکن ان کی شاعری میں بھی زندگی کی حقیقتیں نمایاں ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی نظموں میں رومان اور حقیقت کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ فیض کی شاعری احساس کی شدت کی شاعری ہے۔ جذبے کی شاعری ہے۔ خلوص کی شاعری ہے اور بلندی شعور کی شاعری ہے۔ ان کے نزدیک حیات و کائنات کا واضح نقطہ نظر موجود ہے۔ اسی لئے ان کی شاعری میں اجتماعی زندگی کے بعض اہم مسائل کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ ان کے یہاں نیا رنگ و آہنگ اور فن کا جو رچاؤ ملتا ہے وہ انھیں ان کے معاصرین شعرا میں ممیز و ممتاز بناتا ہے۔ علی سردار جعفری کا ذہن ایک انقلابی آدمی کا ذہن ہے اس لئے ان کی نظمیں انقلابی آہنگ سے معمور معلوم ہوتی ہیں وہ ارتقا کا ایک واضح تصور رکھتے ہیں۔ ہم انھیں ایک اشتراکی شاعر کہہ سکتے ہیں کیونکہ ان کے خیالات اشتراکیت سے بے حد قریب ہیں۔ علی جواد زیدی کے یہاں سردار جعفری کی طرح نظریے کی پختگی اور شعور کی گہرائی تو نہیں پائی جاتی لیکن زندگی کے اجتماعی موضوعات و مسائل سے انھیں بھی شغف ہے۔ یہی سبب ہے کہ سماجی معاملات پر مبنی نظمیں ان کے یہاں بھی موجود ہیں۔ جاں نثار اختر کا شمار ممتاز ترقی پسند شعرا میں ہوتا ہے جوش ملیح آبادی کے الفاظ میں وہ "اردو شاعری کے اختر تابندہ

ہیں"۔۔۔جاں نثار اختر جوش سے بے حد متاثر نظر آتے ہیں ان کی شاعری میں جوش کے اثرات بڑے گہرے ہیں، ان کے یہاں رومان بھی ہے اور حقیقت بھی۔۔۔ان کے یہاں سماجی زندگی کا شعور بہت گہرا ہے۔ ان کی شاعری کا کینوس (Canvas) بہت بڑا ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں زندگی کے اہم بنیادی مسائل و موضوع کو سمیٹ کر پیش کیا ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے اعلی درجے کی رومانی شاعری کی ہے لیکن دراصل ان کا رجحان حقیقت پسندی کی طرف ہے۔ جس کے باعث حقیقت سے بھرپور نظمیں ان کے یہاں ملتی ہیں۔ وہ زندگی کے تمام حالات سے گہری واقفیت رکھتے ہیں اور حیات و کائنات میں جو کش مکش جاری ہے انھیں بہ خوبی اس کا علم بھی ہے۔ ان کی نگاہ میں انسان عظیم ہے اسی لئے وہ انسان کی عظمت اور اس کی برتری کا حسین خواب برابر دیکھتے ہیں۔ اور انسانی عظمت کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں۔ ساحر لدھیانوی کا ذہن بھی سردار جعفری کی طرح ایک انقلابی و باغی انسان کا ذہن ہے اس لئے وہ اپنے آس پاس کی دنیا اور زندگی کو اسی نقطہ نظر سے دیکھنے کے عادی ہیں۔ جدید اردو شاعری میں ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے معمولی سے معمولی اور عام سے عام موضوعات کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا اور نئے نئے پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ سلام مچھلی شہری کی شاعری میں احساس کی تیزی اور شدت پائی جاتی ہے اور شاید اسی احساس کی شدت کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ حیات کے تمام پہلوؤں سے بے حد متاثر ہوئے ہیں۔ اور زندگی کے تمام پہلوؤں پر اپنی نظموں کے ذریعہ روشنی ڈالتے ہیں۔ ان کی نظموں میں موضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے مگر گہرائی نہیں پائی جاتی۔ جدید اردو شاعری میں متذکرہ شعرا کا مرتبہ و مقام بلند ہے کیوں کہ انھوں نے جدید اردو شاعری میں نت نئے گل و بوٹے کھلائے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر جدید اردو شاعری میں نئی نئی چیزوں کا اضافہ کیا جو قابل قدر اور قابل داد ہیں۔

دور جدید میں جدید شاعری علامتی رجحان سے بھی روشناس ہوئی ہے اس علامتی رجحان کی جھلکیاں مذکورہ بالا شعرا کے کلام میں بعض مقامات پر نظر آجاتی ہیں لیکن خصوصاً

اس رجحان کے علم بردارن۔ م۔ راشد اور میراجی ہیں۔ اس رجحان کو نئے شعور نے پیدا کیا نئے احساس اور نئی فکر کی آغوش میں اس رجحان نے جنم لیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس رجحان کے تحت جو نظمیں لکھی گئیں ان میں نیا رنگ و آہنگ اور نئی دنیا آباد نظر آتی ہے۔ اس رجحان کے علم برداروں کی شاعری میں شدید داخلیت پائی جاتی ہے۔ وہ اپنی ذات کے حدود سے باہر نکل کر نہیں دیکھتے۔ اسی لئے ان کی نظموں میں تحت الشعور کی تہہ در تہہ کیفیات کا اندازہ ہوتا ہے اور ان کے احساس تخیل اور تجزیے کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ان کے موضوعات مروجہ سانچوں اور فارمولوں میں نہیں سماتے ہیں تو انھیں مجبوراً علامتوں اور اشاروں سے کام لینا پڑتا ہے اور اسی صورت حال کے نتیجے میں ان کی نظموں کی ہئیت بھی بدل گئی ہے۔ چنانچہ اس رجحان کے علم برداروں نے نظم معرا اور آزاد نظم کے تجربے کیے۔ راشد اس ضمن میں سب سے آگے ہیں۔ ان کی شاعری علامتی اور اشاراتی شاعری ہے۔ ان کے نزدیک فرد کی ذات ایک انجمن ہے وہ حقائق سے دور بھاگتے ہیں اور زندگی سے فرار اختیار کر لیتے ہیں۔ ان کی ذہنیت ایک شکست خوردہ انسان کی ذہنیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظمیں ایسے ہی انسانوں کی ترجمانی کرتی ہیں۔ لیکن ان کے یہاں اس انفرادی نفسیات پر جو آزاد نظمیں ملتی ہیں ان میں انھوں نے علامتوں اور اشاروں کا سہارا لے کر ایک نئی امیجری کی تخلیق بھی کی ہے اور نہایت حسین و دلفریب پیکر تراشے ہیں، جن کی بدولت ان کی شاعری ایک اچھا خاصہ نگار خانہ بن گئی ہے۔ میراجی نے بھی راشد کی طرح نظمیں لکھی ہیں لیکن ان کا انداز راشد کی نظموں سے بالکل جداگانہ و منفرد ہے وہ بھی فرد کی انفرادی کیفیت کی عکاسی کرتے ہیں مگر ایسی کیفیت کا ذکر کرتے ہیں جو جنسی نوعیت سے تعلق رکھتی ہیں۔ وہ انہی کیفیات کو اپنی نظموں میں پیش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں انہیں بعض عجیب و غریب اشاروں و علامتوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اور اسی کا یہ اثر ہے کہ انکی بیشتر نظمیں ابہام کا شکار ہو جاتی ہیں۔ بہر حال وہ انسانی فطرت کے نباض ہیں۔ وہ انسانی نفسیات کے نشیب و فراز کو بخوبی سمجھتے ہیں اور اس کے مختلف پہلوؤں کی تصویر کشی میں فنی مہارت رکھتے ہیں۔ راشد اور میراجی دونوں نے جدید

اردو شاعری میں جو نئے نئے موضوعات پیش کیے ہیں اور ہئیت میں جو جدتیں پیدا کی ہیں ان کے اس دین سے انکار کرنا سراسر ادبی بددیانتی ہوگی۔ راشد اور میراجی کے علاوہ اس رجحان کے علم برداروں میں ڈاکٹر تصدق حسین خالد، اختر الایمان، منیب الرحمٰن، یوسف ظفر، مختار صدیقی اور ضیا جالندھری وغیرہ کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ ان شاعروں نے اپنی اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہوئے جدید شاعری کے علامتی رجحان کو فروغ دینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

جدید شاعری کے زمرے میں محض نظم نگاری ہی نہیں آتی بلکہ جدید غزل بھی اس میں اپنی ایک انفرادیت رکھتی ہے۔ جدید غزلوں کا جائزہ لینے کے بعد یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ جدید غزل کا عہد غالب کے عہد سے شروع ہوتا ہے۔ غالب نے غزل کو نئی زندگی اور نئی توانائی بخشی۔ انھوں نے اردو غزلوں میں انسانی زندگی کی حقیقی تصویروں کو پیش کیا۔ حیات و کائنات کے بنیادی حقائق اور فکر و فلسفہ کا عنصر بھی اس میں داخل کیا۔ میرے نزدیک غالب کی عظمت کا راز یہ ہے کہ انھوں نے غزل کے اسلوب میں وسعتیں پیدا کر دیں۔ اس کو پہلو دار رنگین اور پرکار بنایا۔ چنانچہ ان باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ جدید غزل کی راہ تعمیر ہوئی اور اس نے اسی راستے پر آگے چلنا شروع کر دیا۔ غالب کے بعد اردو غزل کو جدید بنانے میں مولانا الطاف حسین حالی کا مقام آتا ہے۔ انھوں نے غزل کی اصلاح کی اور اس سلسلے میں بعض مفید مشورے دیئے۔ ان کی غزلوں میں ایک نیا عالم آباد نظر آتا ہے انھوں نے سب سے پہلے قومی اور اصلاحی مضامین غزل میں داخل کرنے کا تجربہ پیش کیا اور غزل میں نئے نئے علامات و اشارات کا استعمال شروع کر کے اس میں ترسیل و اظہار کے لئے نئے راستے متعین کیے۔ حالی کے بعد یہ رجحان اقبال اور چکبست تک جا پہنچتا ہے۔ اقبال نے دامان غزل کو آفاق کی وسعتوں میں گم کر دیا۔ اقبال نے غزلوں کو نئی نئی علامتیں بخشیں اور نئے نئے اشارات و کنایات سے بھی آشنا کیا۔ انھوں نے فکر و فلسفہ کے عناصر کو بھی اپنی غزلوں کا موضوع بنایا۔

چکبست کے یہاں جذبات و معاملات کی عکاسی برائے نام بھی نہیں ملتی اور نہ توان

کی غزلوں میں حسن و عشق کی چاشنی موجود ہے۔انھوں نے اپنی غزلوں میں حیات و کائنات کے فلسفیانہ پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور اپنے دور کے سیاسی و سماجی معاملات کی حسین عکاسی بھی کی ہے۔ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے ان موضوعات کو اپنی غزلوں میں اس طرح پیش کیا کہ غزل پر کوئی آنچ نہیں آنے دی۔اقبال اور چکبست کے ساتھ ہی جدید اردو شاعری میں ایک رومان پسند رجحان ابھر کر سامنے آتا ہے جس کے سب سے بڑے علم برداروں میں حسرت موہانی کا نام لیا جاتا ہے بلاشبہ حسرت موہانی کے یہاں محض رومان پرور خیالات ہی نہیں ملتے۔ بلکہ ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے زندگی کے رومان اور جذبات کو حقیقت و واقعیت کے رنگ میں پوری طرح رنگ دیا۔ان کے کلام میں (خصوصاً غزلوں میں) حزن و ملال کا عنصر کہیں نہیں ملتا۔ بلکہ ان کی ساری غزلیں مسرت و شادمانی۔ نشاط ہی نشاط اور عزم و حوصلے سے بھری پڑی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں ایک عجیب لطف اور حسن کا احساس ہوتا ہے۔ حسرت کے ساتھ جدید غزل گو کی حیثیت سے اصغر گونڈوی کا نام بھی عزت واحترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔انھوں نے غزلوں میں تصوف کو پیش کیا۔ان کی غزلوں میں تہذیب شگفتگی، رکھ رکھاؤ اور جو بانک پن ہے۔ وہ کسی دوسرے جدید شاعر کو نصیب نہیں، اصغر کے علاوہ فانی بدایونی کا شمار بھی جدید غزل گو شعرا میں ہوتا ہے۔ان کی غزلوں میں غم والم اور حزینہ والمیہ پہلوؤں کی ترجمانی زیادہ تر ہوتی ہے۔ان کے یہاں درد و غم کا ایک واضح تصور اور فلسفہ پایا جاتا ہے ان کا جدید شاعری پر یہ احسان ہے کہ انھوں نے اپنی غزلوں میں مفکرانہ و فلسفیانہ آہنگ پیدا کیا۔ فانی کے ساتھ ساتھ جگر مرادآبادی نے بھی غزل کو جدید سے جدید تر بنانے کی سعی کی ہے۔ان کی غزلوں میں جوش و سرمستی اور رندی کی جو کیفیت ملتی ہے۔وہ ان سے قبل بالکل مفقود ہے۔

فراق گورکھپوری جدید غزل نگاروں میں ایک ممتاز مقام کے حامل ہیں۔ انھوں نے غزلوں میں انسان کا نیاذہن دیا اور بے شک اس نئے ذہن میں جدید دور کی ساری رنگینیاں سمٹ آئی ہیں۔ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے صرف عشق کے پہلوؤں کی نقاب

جاں نثار اختر کا مقام

جدید شعرا کی صف میں

یہ ایک حقیقت مسلمہ ہے کہ ترقی پسند تحریک کہ زیر سایہ اردو شاعری روایتی حدود سے نکل کر آفاق کی وسعتیں طے کرنے لگی۔ اسلوب وہئیت کے اعتبار سے بھی اس میں نت نئے تجربے ہوئے۔ اس طرح اس کے لب ولہجے میں ایک خوش گوار تبدیلی آئی اور اسی تحریک کے زیر اثر آزاد نظم کی بھی داغ بیل پڑی۔ اس کو خوب سے خوب تر بنانے اور مقبولیت کا درجہ عطا کرنے کی پوری کوشش کی گئی۔ اس دور کے شعرا میں فیض احمد فیض، مخدوم محی الدین، علی سردار جعفری، اسرار الحق، مجاز، پرویز شاہدی، معین احسن جذبی، منیب الرحمن، ساحر لدھیانوی، اور جاں نثار اختر کے نام سر فہرست ہیں۔ ترقی پسندوں میں مخدوم وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے "اندھیرا" کے عنوان سے ایک آزاد نظم لکھ کر اردو میں آزاد نظم کی ابتدا کی۔ گویا آزاد نظم کی دنیا میں مخدوم کو اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ وہ اس صنف سخن کے بانی ہیں۔ پھر ان کے بعد سردار جعفری نے بھی آزاد نظمیں لکھیں اور اس کے لب ولہجے میں نمایاں تبدیلیاں کیں۔ اس ضمن میں ہم نمونتاً "نئی دنیا کو سلام" "خون کی لکیر" اور

"پتھر کی دیوار" جیسی نظموں کو پیش کر سکتے ہیں فیض کی نظم "موضوع سخن" اور "سوچ" پرویز شاہدی کی نظم "بنت ہمالہ" اور "ساز مستقبل" مجاز کی "آوارہ" ساحر کی "تاج محل" مخدوم کی "طور" جذبی کی "موت" اور جاں نثار اختر کی بے زاری وغیرہ اس نوع کی نظمیں ہیں جو اس دور کے میلانات کی نمائندگی بڑے حسین انداز میں کرتی ہیں اور بلا جھجک کہا جاسکتا ہے کہ ترقی پسند شاعری نے اپنی بہت سی خامیوں کے باوجود اردو کے شعری سرمائے میں کافی اضافہ کیا۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد اب ہم یہ دیکھیں کہ جدیدیت کا اصل مفہوم کیا ہے؟ اور جدید شاعری ہم کسے کہہ سکتے ہیں؟ اس ضمن میں ہم اردو کے چند مشاہیر اہل قلم کے اقوال درج کرتے ہیں۔ پھر اس کے بعد ہم انہی اقوال کی روشنی میں اپنا تجزیہ پیش کریں گے۔ ایم۔ یٰسین لکھتے ہیں:

"جدیدیت نہ کوئی تحریک ہے اور نہ اردو ادب میں کسی اضافی شے کی حیثیت رکھتی ہے۔ قلی قطب شاہ اور ولی دکنی کے یہاں بھی جدیدیت تھی جو اردو شاعری کے آغاز سمجھے جاتے ہیں اور آج بھی ہیں۔ جب کہ پرکاش فکری، سلطان اختر، لطف الرحمٰن، ندا فاضلی، ظہیر صدیقی، اور ظہیر غازی پوری وغیرہ جیسے باضابطہ جدید شاعروں کا عہد ہے۔ میرے خیال میں جدیدیت اس سچے تخلیقی رویے کا نام ہے جو کسی بھی فنکار کو اس کی آفاقی آگہی کی بنا پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ جاوید بنا دیتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ موجودہ عہد میں جدیدیت یعنی داخلی عرفان اور اس کی پیش کش کا رجحان شدید کا نتیجہ ہے لیکن اس پرانے عہد کے بھی بعض نئے فنکاروں کے یہاں جدیدیت کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ غالب نے بہت پہلے بے در و دیوار کے گھر بنانے کی تمنا کر کے Space اور Time کی مروجہ حد بندیوں کے ٹوٹ جانے کا اعلان کر دیا تھا۔"[1]

شجاع فرخی نے اپنے ایک مضمون میں "جدیدیت" پر یوں اظہار خیال کیا ہے:

۱۔ جدیدیت ایک نظر میں ایم۔ یٰسین ہفتہ وار مورچہ، گیا ۱۳ر جولائی ۱۹۷۴ء

"جدیدیت روشن اور بے دار تخیل، فکر کی گہرائی و گیرائی، انسانی جذبات و احساسات اور حیات و کائنات کے تمام ظاہری اور باطنی پہلوؤں کی عکاسی کا نام ہے۔ جدیدیت کی زبان اور اظہار عصر کے تخلیقی تقاضوں سے عبارت ہیں۔ آج کے ادب میں نئے تجربات کی اہمیت اور اس کی ضرورت پر زور دیا جاتا ہے۔۔ جدیدیت کا مقصد یہ قطعی نہیں کہ قدیم کی تمام روایات کو ڈھادیا جائے۔ بلکہ جو روایات انسانی زندگی کا ناگزیر حصہ بن چکی ہیں انھیں جدیدیت کے دھارے میں شامل رہنے دیا جائے اور باقی تمام سڑی گلی روایتوں کو ماضی کی قبر میں ہی دفن کردینا بہتر ہے۔ اکثر و بیشتر دیکھنے میں آرہا ہے کہ وہ الفاظ و محاورات جنھیں قدماء نے ترک کردیا تھا۔ آج استعمال کیے جارہے ہیں۔ کیونکہ تخلیق کار نے اپنی حسیت کی مدد سے ان الفاظ و محاورات میں معنی کی نئی سطحیں دریافت کرلی ہیں اور بھرپور تخلیقی تاثیر کے ساتھ انھیں پیش کیا ہے۔ جدیدیت کی برکت سے زبان میں ذخیرہ الفاظ کا ہی اضافہ نہیں ہوا بلکہ زبان میں اشاریت اور تہہ داری کی وہ قوت بھی بحال ہوئی ہے جو زندہ زبانوں کا خاصہ ہے۔"

نئی شاعری یا جدید شاعری کے متعلق اردو کے مشہور و معروف نقاد ڈاکٹر قمر رئیس کے خیالات ملاحظہ فرمایئے:

"نئی شاعری" سے متعلق میری مراد بدلتے ہوئے حقائق کے بارے میں وہ نیا رویہ "نیا انداز" اور طرز احساس ہے جو شاعری میں نئے تجربات اور نئے رجحان کی صورت میں نئے امکانات کی بشارت ہو میرا خیال ہے کہ ۱۹۵۰ء کے آس پاس اردو کے جن شعرا نے سن و سال اور شعور کے اعتبار سے بلوغ کی منزل میں قدم رکھا۔ ان کی شعری تخلیقات واضح طور پر ان امکانات کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ اس دور میں اس پود کے شعرا نے اظہار و ابلاغ کی سعی میں پست و بلند ہر طرح کے تجزیے کیے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی اس سعی مسلسل نے اپنے امکانات پا کر اب ایک رجحان یا بعض حیثیتوں سے ایک تحریک کی شکل اختیار کرلی ہے۔"[1]

۱۔ جدید شاعری ایک سمپوزیم ڈاکٹر قمر رئیس

ایک اور معتبر ناقد ڈاکٹر صفدر آہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"میں جدید اس شاعری کو کہتا ہوں جو ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ۱۹۳۶ء سے شروع ہوئی یہی وہ زمانہ ہے جہاں سے ہمارے شعر و ادب میں تبدیلی آئی ہے۔ جو ہزاروں تغیرات اور انقلابات کی بنیاد ہے۔"[۱]

مذکورہ بالا حوالوں کے پیش نظر ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جدید اردو شاعری ترقی پسند شاعری کے بطن سے پیدا ہوئی ہے۔ گویا جدید اردو شاعری کا تصور ترقی پسند شاعری کے بغیر ناممکن ہے بہ الفاظ دیگر ترقی پسند شاعری کے پس منظر ہی میں جدید شاعری کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر قمر رئیس نے ایک مقام پر نئی شاعری (جدید شاعری) کو "ترقی پسند شاعری" کی جائز مگر "باغی اولاد" کہا ہے۔ میں ان کے اس قول سے متفق ہوں۔ مگر یہاں پر ایک بات عرض کردینا مناسب سمجھتا ہوں کہ پروفیسر کرامت علی کرامت نئی شاعری کو ایک تحریک کا نام دیتے ہیں۔ اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ جدید شاعری کو ایک تحریک کی حیثیت سے تسلیم نہیں کرتے۔ میں بھی نئی شاعری کو تحریک تصور نہیں کرتا ہوں بلکہ میں اسے ایک رجحان مانتا ہوں۔ کیونکہ اس کے پیچھے نہ کوئی تنظیم ہے نہ کوئی جماعت۔ اور نہ نئے شاعروں کا کوئی بندھا ٹکا پروگرام ہی ہے۔ یہاں پر یہ بھی سمجھ لیجئے کہ نئی شاعری نئے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو کر نیا میلان دینے کی جو کوشش کر رہی ہے۔ یہ صرف اردو شعرا کا ہی واحد کارنامہ نہیں ہے بلکہ دنیا کی دوسری زبانوں میں بھی اس طرح کی کوششیں جاری ہیں۔ خصوصاً اشتراکی ممالک میں یہ رجحان بڑی تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ چنانچہ یہی سبب ہے کہ احساس فکر اور تخیل کے لحاظ سے نئی شاعری دنیا کی دوسری مختلف زبانوں میں بھی ہو رہی ہے اور میرے خیال میں جدید شاعری کے پنپنے کے کچھ اور محرکات بھی ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ گزشتہ دور کی شاعری سے نوجوان اردو شعرا کو اطمینان نصیب نہیں ہوا اور اس کے لئے وہ لوگ دوسری زبانوں کے اچھے شعری سرمایہ کی

۱۔ جدید شاعری سمپوزیم ڈاکٹر صفدر آہ

طرف متوجہ ہوئے۔اس سلسلے میں نئے شعرانے ہندی، انگریزی، بنگلہ ،اور روسی شاعری کا مطالعہ براہ راست کیا۔ بعد ازاں جب ان لوگوں نے یہ دیکھا کہ ان کی شاعری آفاقی شاعری کے معیار پر پوری نہیں اترتی تو ان لوگوں نے نئی منزلیں دریافت کیں۔اور نئے راستے ہموار کیے۔ گویا اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ جدید شعرانے اپنی پرانی شاعری کی بعض فرسودہ روایات سے گریز کر کے اور قابل اعتنا عناصر کو اپنے اندر جذب کر کے جدید اردو شاعری کو جنم دیا۔ جاں نثار اختر ترقی پسند اردو شاعری اور جدید اردو شاعری کے بیچ کی کڑی ہیں۔انھوں نے ترقی پسند اردو شاعری سے مکمل انحراف نہیں کیا ہے۔ وہ اپنے قدیم ادبی روایات کا احترام کرتے ہوئے جدید شعری روایات کا بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ خیر مقدم کرتے ہیں:

ہر چند نیا ذہن دیا ہم نے غزل کو
دل ہے کہ مگر پاس روایات کرے ہے

میں اپنے اس خیال کی تائید میں ڈاکٹر ظ۔انصاری کی وہ رائے پیش کر رہا ہوں جو انھوں نے جاں نثار اختر کی شاعری کے متعلق دی ہے۔

”جاں نثار اختر رومانی وجذباتی شاعری سے اپنا قدم آگے بڑھاتا ہے تو وہ ایک نظریاتی قوت کو بنیادی عقیدے کی صلابت کو نگاہ کی وسعتوں کو تلخیوں، پرچھائیوں کے ذاتی تجربوں کو ساتھ لیے اس محفل میں قدم رکھتا ہے جہاں عہد حاضر کی حسیت ایک کوڈ ورڈ (Code Word) شناختی لفظ اور خود وجودیت سے جدیدیت تک مختلف اصطلاحوں کی رنگا رنگ جھنڈیاں ٹنگی ہوئی لہرا رہی ہیں۔ یہاں تک پہنچنے میں اسے طول، طویل یاد شوار گزار سفر نہیں کرنا پڑا ”بس ایک نہیں کی نہیں سہی“ اتنا ہی۔اور وہ نہیں بھی اس نے کوئی اونچی آواز میں نہیں کی۔ اب غزل کے لہجے سے ہم آہنگ ہو کر روز مرہ کے الفاظ اصطلاحوں اور استعاروں کو اپنا کر اپنی غزلوں کا تار باندھ دیا۔ جو صورت ومعنی کے اعتبار سے جدید تر بھی ہیں اور پرانی شاعری کی روش کا ایک تسلسل بھی ہیں۔“[1]

---

[1] فن اور شخصیت : جاں نثار اختر ص ۴۹۔۴۸

جاں نثار اختر ترقی پسند شاعر تھے اس حقیقت سے انکار کی گنجائش نہیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جاں نثار اختر نے اپنی شاعری کا سفر ہمیشہ جاری رکھا اور آگے کی جانب بڑھتے ہی رہے اور نئی چیزوں، نئے نئے رجحانات و میلانات سے کبھی تنفر نہ ہوئے بلکہ ان رجحانات کو سمجھتے رہے اور اپنی شاعری کا رخ بھی بہتے ہوئے دھارے کی طرف موڑتے رہے اور انھوں نے اس بات کا اعتراف بھی کیا کہ پرانی ڈگر پر جتنے دنوں تک چلتے رہے وہ بہر حال غلط تھا۔

زندگی تجھ کو بھلایا ہے بہت دن ہم نے
وقت خوابوں میں گنوایا ہے بہت دن ہم نے

کیا پتہ ہو بھی سکے اس کی تلافی کہ نہیں
شاعری تجھ کو گنوایا ہے بہت دن ہم نے

دراصل یہاں پر ہم یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ جاں نثار اختر باوجودیکہ ایک ترقی پسند شاعر تھے لیکن وہ ترقی پسند شاعر ہوتے ہوئے بھی ایک جدید شاعر تھے۔ چنانچہ اس ضمن میں اردو کے مشہور جدید شاعر بمل کرشن اشک کی یہ رائے قابل غور ہے:

"جاں نثار اختر کے یہاں جدیدیت کی ہر وہ خوبی موجود ہے جس کی جدید شعرا سے امید کی جاسکتی ہے۔ حقیقت یوں ہے کہ جدیدیت کسی کی جائداد نہیں ہے۔ غالب اپنے زمانے میں جدید تھے اور میں اور جاں نثار اختر اپنے زمانے میں جدید ہیں۔ ہم میں جو تفریق پیدا کی گئی ہے اس کے پس پشت یا ادبی سیاست ہے یا ذاتی مفاد"۔

گویا یہ واضح ہو گیا کہ جاں نثار اختر ترقی پسند شاعر کے علاوہ جدید شاعر بھی ہیں۔ اب ہم یہ بھی دیکھیں کہ آخر وہ کون سی خصوصیات ہیں جن کی بنا پر کسی بھی دور کے ادیب اور شاعر کو ہم جدید کہہ سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں مختصراً عرض کرنا ہے کہ داخلی عناصر کی

کار فرمائی۔ آفاقی قدروں کی آویزش، فطرت کی گہرائی میں ڈوب جانے کی کوشش، ذات کی گوناگوں لامحدودیت، عدم تحفظ، تنہائی انسان کا ذکر، انتشار، شکیب وریخت، تاریکی لاعلمی، بے بسی، بے کاری اور لاچارگی وغیرہم ---یہی وہ چند خصوصیات ہیں جن کی بنا پر ہم کسی بھی دور کے ادباو شعرا کو جدید کہہ سکتے ہیں۔ یعنی جن کے فن میں یہ ساری صفتیں موجود ہوں گی انھیں ہم جدید کہیں گے۔ برخلاف اس کے جو شاعر یا ادیب مذکورہ بالا باتوں کو اپنے فن پارے میں پیش کرنے سے قاصر رہے گا اسے ہم جدید تسلیم نہیں کریں گے۔

اس بحث کے بعد اب ہم جاں نثار اختر کا موازنہ اردو کے مختلف جدید شعرا سے کریں گے اور اشعار سے حوالے دیں گے تا کہ یہ ثابت ہو جائے کہ جدید شعرا کی صف میں جاں نثار اختر کا کیا مرتبہ و مقام ہے۔

جاں نثار اختر بھی "عصری حسیت" اور "عصری آگہی" رکھتے ہیں اور جدید شعرا کے دوش بدوش چلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے تمام عصری تقاضوں کو پورا کرنے کی شعوری کوشش کی ہے۔ آج کے دور میں کوئی بھی عقیدہ پورا نہیں ہے۔ یعنی عہد حاضر انسانی اقدار کی شکست وریخت کا عہد ہے۔ درج ذیل اشعار اس حقیت کی صاف غمازی کرتے ہیں۔

یہ کیا عذاب ہے سب اپنے آپ میں گم ہیں
زباں ملی ہے مگر ہم زبان نہیں ملتا
(ندافاضلی)

کھو گیا گرد سفر میں میری منزل کا نشاں
اور تاحد نظر نقش کف پا بھی نہیں
(سید ارشاد حیدر)

خلاء، زمیں، سمندر، سلگتے صحرا میں
کہیں ملے کوئی راہ نجات ناممکن
(سلطان شاہد)

اس قدر رنگینیوں کے باوجود
جانے کیوں آنکھوں میں اتنا درد ہے

(اشفاق انجم)

ہرایک موڑ پہ ہم ٹوٹتے بکھرتے رہے
ہماری روح میں پنہاں قیامتیں تھیں بہت

(ناصر زیدی)

ہر آن ٹوٹتے یہ عقیدوں کے سلسلے
لگتا ہے جیسے آج بکھرنے لگا ہوں میں

(جاں نثار اختر)

کس عقیدے کی دہائی دیجئے
ہر عقیدہ آج بے اوقات ہے

(جاں نثار اختر)

انقلابوں کی گھڑی ہے
ہر نہیں ہاں سے بڑی ہے

(جاں نثار اختر)

جدید شعرا کا یہ ایک عام رجحان ہے کہ وہ نئی نئی ردیفیں اور نئے نئے قافیے تلاش کرتے ہیں اور اس قبیل کے قافیے اور ردیف جدید شاعری میں کافی مستعمل ہیں۔ مثلاً "ہوا لگے" "سانحہ لگے" "سا لگے" "سویرا دکھائی پڑتا ہے" "شرر دکھائی دیتا ہے" "دعا دی جائے" "صدا دی جائے" "سزا دی جائے" "دعا لگے ہے مجھے" "دوا لگے ہے مجھے" وغیرہ وغیرہ۔

ایک جدید شاعر رشید عبدالسمیع جلیل کی غزل کے تین اشعار اور جاں نثار اختر کی غزل کے بھی تین اشعار پیش کر رہا ہوں۔ آپ دونوں کے اشعار پڑھنے کے بعد یقیناً بلا

جھجھک کہہ اٹھیں گے کہ جاں نثار اختر کا پلہ گراں ہے۔

کیا ایک دوسرے کو کسی کی ہوا لگے
ہر شخص اپنی ذات میں کھویا ہوا لگے

کیا کیا طلسم خواب ہیں آنکھوں کے رو برو
ٹوٹے کہیں نظر تو کوئی۔۔۔سانحہ لگے

میں خود کو گن رہا ہوں نتیجہ سے بے خبر
ہر سانس زندگی کی مجھے ابتدا لگے

(رشید عبدالسمیع جلیل)

ہر ایک شخص پریشاں و در بدر سا لگے
یہ شہر مجھ کو تو یارو کوئی بھنور سا لگے

کسے پتا ہے کہ دنیا کا حشر کیا ہوگا
کبھی کبھی تو مجھے آدمی سے ڈر سا لگے

وہ تند وقت کی رو ہے کہ پاؤں ٹک نہ سکے
ہر آدمی کوئی اکھڑا ہوا شجر سا لگے

(جاں نثار اختر)

اب جاں نثار اختر کی دوسری غزل کے یہ اشعار دیکھئے۔

جب لگیں زخم تو قاتل کو دعا دی جائے
ہے یہی رسم تو یہ رسم اٹھا دی جائے

دل کا وہ حال ہوا ہے غمِ دوراں کے تلے
جیسے اک لاش چٹانوں میں دبا دی جائے

ہم نے انسانوں کے دکھ درد کا حل ڈھونڈ لیا
کیا برا ہے جو یہ افواہ اڑا دی جائے

ہم کو گزری ہوئی صدیاں تو نہ پہچانیں گی
آنے والے کسی لمحے کو صدا دی جائے

ان اشعار کے مقابلے میں اقبال متین کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے اور خود فیصلہ کیجئے کہ کس کو کس پر فوقیت حاصل ہے۔

رسم پابندیٔ آداب اٹھا دی جائے
اس کے در پر جو کھڑے ہیں تو صدا دی جائے

آئینے عکس نہ دکھلاتے تو کچھ بات بھی تھی
اب تو تصویر ہی کمرے سے ہٹا دی جائے

میں اسے درد کی صورت بھی نہ پہچان سکوں
مجھ کو جینے کی کچھ ایسی بھی سزا دی جائے

میں تو ٹوٹی ہوئی اک چیخ کا سناٹا ہوں
میری آواز کہیں ہو تو سنا دی جائے

اب ذیل میں مزید دو جدید شعرا کی غزل کے اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

دلوں کی اور دھواں سا دکھائی دیتا ہے
یہ شہر تو مجھے جلتا دکھائی دیتا ہے
(احمد مشتاق)

یہ شہر ہیں کہ صداؤں کے گونجتے جنگل
نہ کوئی جسم نہ چہرہ دکھائی دیتا ہے

(خورشید احمد جامی)

اور اس بحر میں محض ردیف میں تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ جاں نثار اختر کی غزل کا مطالعہ کیجئے اور اس کے کمال فن کی داد دیجئے۔

افق اگرچہ پگھلتا دکھائی پڑتا ہے
مجھے تو دور سویرا دکھائی پڑتا ہے

ہمارے شہر میں بے چہرہ لوگ بستے ہیں
کبھی کبھی کوئی چہرہ دکھائی پڑتا ہے

جو اپنی ذات سے اک انجمن کہا جائے
وہ شخص تک مجھے تنہا دکھائی پڑتا ہے

چمکتی ریت پہ یہ غسل آفتاب تیرا
بدن تمام سنہرا دکھائی پڑتا ہے

نہ کوئی خواب، نہ کوئی خلش، نہ کوئی خمار
یہ آدمی تو ادھورا دکھائی پڑتا ہے

اردو کے مشہور و ممتاز جدید شاعر بمل کرشن اشک ایک مقام پر رقمطراز ہیں :

"جدید شاعری ترقی پسند شاعری کی ضد ہے اور مجھے یہ یقین ہے کہ جاں نثار اختر ایک ترقی پسند شاعر ہو کے بھی جدید ہیں، جدید شاعری نے الفاظ کو نئے معنی دیے ہیں اور اس کے لئے دو طریق خاص طور پر استعمال کیے ہیں۔ایک تو ایسی ردیفیں وضع کی ہیں جو غزل کو علامتی رنگ دے سکیں۔دروازے، مانجھی، قمیض بابا اور اس قسم کے الفاظ جب ردیف میں

مستعمل ہوں گے تو لازمی طور پر ایک علامتی روپ دھار لیں گے۔ یہ علامتیں روایتی شاعری کی علامتوں سے از حد مختلف ہیں ان کا نزدیکی رشتہ شعور اور لاشعور کی سائکولوجی (Psychology) سے ہے۔ موج شعور سے متعلق تکنیکی ناولوں میں علامت مختلف کرداروں اور مختلف اوقات میں مختلف رنگ دھارتی رہتی ہے۔ یوں بھی غزل شعور کی بے ضابطگی کی امین ہے ضروری نہیں کہ غزل کے مختلف اشعار ایک دوسرے سے متعلق ہوں۔ انھیں اگر کوئی چیز ایک دوسرے سے منسلک کرتی ہے تو ردیف و قافیہ اور بحر۔۔۔اس لئے اگر غزل کو نعرہ بازی کا ذریعہ بنانے کی سعی بھی کی جائے تو سوائے ناکامی کے اور کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ دوسرا طریق جو جدید شاعری نے تشبیہوں کو اثاثہ بنانے کے لئے وضع کیا ہے وہ ایک خاص قسم کی ردیف ہے۔ جو شاعر کو تشبیہوں کی تلاش میں سرگرداں کر سکتی ہے۔ جیسے لگے ہے مجھے، لگے، لگتی ہے، کسی طرح، سا لگے دکھائی پڑتا ہے، لگتا ہے، لگے ہے، مانگے ہے،۔۔۔ میں یہ ہرگز نہیں کہہ رہا ہوں کہ ان غزلوں میں ہر شعر ایک تشبیہ لیے ہوئے ہے۔ مگر ایسی زمینیں وضع کرنا جن میں تشبیہ کا استعمال آزادانہ طور پر ہو سکے جدید شاعری کا حصہ ہے "لگے" ایک ایسا لفظ ہے جو حقیقت اور ظاہر کے درمیانی فاصلہ کو اظہار بخش سکتا ہے۔ "جو تشکیک کا مادہ آج کی زندگی میں زور پکڑ رہا ہے۔ اسے الفاظ کا جامہ پہنا سکتا ہے اور جاں نثار اختر اس پہلو پر احساساتی نظر رکھتے ہیں۔"

بمل کرشن اشک نے جو دعوے کیے ہیں ان کی دلیل جاں نثار اختر کی درج ذیل غزلوں کے اشعار میں ملے گی۔

یہ زندگی مجھے کھلتی ہوئی کتاب لگے
ورق ورق کوئی تاریخ انقلاب لگے

ملا ہوں آج مگر اس میں کوئی جھوٹ نہیں
کہ تو مجھے کوئی دیکھا ہوا سا خواب لگے

نشہ کی چیز یہاں صرف شغل بادہ نہیں
کبھی کبھی تو یہی زندگی شراب لگے

شکستہ میز پر رکھی ہوئی یہ بند گھڑی
نہ جانے کیوں مری ہر بات کا جواب لگے

☆☆

رخوں کے چاند، لبوں کے گلاب مانگے ہے
بدن کی پیاس بدن کی شراب مانگے ہے

جواضطراب بہ ظاہر سکون لگتا ہے
ہر ایک شعر وہی اضطراب مانگے ہے

تمام عرصۂ ہستی دھواں ہے تو کیا
ہرایک آنکھ محبت کا خواب مانگے ہے

میں کتنے لمحے نہ جانے کہاں گنوا آیا
تری نگاہ تو سارا حساب مانگے ہے

☆☆☆

ہر یک روح میں اک غم چھپا لگے ہے مجھے
یہ زندگی تو کوئی بددعا لگے ہے مجھے

دبا کے آئی ہے سینے میں کون سی آہیں
کچھ آج رنگ ترا سانولا لگے ہے مجھے

نہ جانے وقت کی رفتار کیا دکھاتی ہے
کبھی کبھی تو بڑا خوف سا لگے ہے مجھے

میں سو بھی جاؤں تو کیا میری بند آنکھوں میں
تمام رات کوئی جھانکتا لگے ہے مجھے

بکھر گیا ہے کچھ اس طرح آدمی کا وجود
ہر ایک فرد کوئی سانحہ لگے ہے مجھے

☆☆☆☆

نہ جانے کب کوئی طوفان آئے گا یارو
بلند موج سے ساحل قریب لگتا ہے

حدود ذات سے باہر نکل کے دیکھ ذرا
نہ کوئی غیر نہ کوئی رقیب لگتا ہے

یہ دوستی، یہ مراسم، یہ چاہتیں، یہ خلوص
کبھی کبھی مجھے سب کچھ عجیب لگتا ہے

☆☆☆☆☆

راس اب آئے گی اشکوں کی نہ آہوں کی فضا
آج کا پیار نئی آب وہوا مانگے ہے

چپ ہے ہر زخم گلو، چپ ہے شہیدوں کا لہو
دست قاتل ہے کہ محنت کا صلہ مانگے ہے

بانسری کا کوئی نغمہ نہ سہی، چیخ سہی
ہر سکوت شب غم کوئی صدا مانگے ہے

☆☆☆☆☆☆

کوئی آسودہ نہیں اہل سیاست کے سوا
یہ صدی دشمن ارباب ہنر لگتی ہے

جل گیا اپنا نشیمن تو کوئی بات نہیں
دیکھنا یہ ہے کہ اب آگ کدھر لگتی ہے

لمحے لمحے میں بسی ہے تری یادوں کی مہک
آج کی رات تو خوشبو کا سفر لگتی ہے

ہم نے ہر گام پہ سجدوں کے جلائے ہیں چراغ
اب تری راہ گزر، راہ گذر لگتی ہے

جدید غزل پر بحث کرتے ہوئے نامی انصاری لکھتے ہیں۔

"جن لوگوں نے جدیدیت کو صرف فیشن کے طور پر قبول نہیں کیا انھوں نے نئے اسالیب بیان کے ساتھ نئے اور اچھوتے تجربے کو بھی غزل میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ میں اسے جدیدیت کا بڑا کارنامہ سمجھتا ہوں کہ اس نے روایتی مضامین حسن و عشق اور اخلاق و تصوف اور ان کے لوازمات سے عمداً گریز کیا ہے اور اس میں زندگی اور فرد کی نفسیات کی دروں بینی کو بروئے کار لانے اور ایسے تجربوں کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے جواب تک

غزل کی قلم رو سے باہر کی چیز سمجھے جاتے تھے۔ ترقی پسند تحریک کے زمانے میں نعرہ بازی کی زیادتی اور سیاسی محرکات کے افراط کے باوجود غزل میں روح عصر کی نمایندگی متانت اور سنجیدگی کے ساتھ کی گئی۔ فیض، مجروح، جاں نثار اختر، مخدوم محی الدین وغیرہ نے جہاں غزل کے فن کو اہتمام واحترام سے برتا۔ وہاں غزل کے نئے امکانات روشن سے روشن تر ہوگئے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ جدید غزل سے بھی نئے امکانات کی مزید راہیں استوار ہورہی ہیں۔ افراط و تفریط تو نئی تحریک کا مقدر ہے۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب گرد چھٹتی ہے اور مطلع روشن ہو جاتا ہے تو کھرے کھوٹے کو پہچاننے اور الگ الگ کرنے کا کام آسان ہو جاتا ہے۔ بہر حال یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ترقی پسند تحریک اور جدیدیت میں نظریاتی بعد کے باوجود غزل کے فکری ارتقا اور مسلسل عمل کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔"[1]

اس پس منظر میں جدید غزل گویوں کے اشعار کے ساتھ ساتھ جاں نثار اختر کے غزلیہ اشعار دیکھیے۔ آپ کو خود ہی اندازہ ہوگا کہ جاں نثار اختر نے غزل کے فن کو جس اہتمام اور جتنے احترام کے ساتھ برتا ہے۔ وہ فقط اختر کا ہی حصہ ہے۔

درج ذیل اشعار کے تقابلی مطالعہ سے یہ حقیقت بھی روشن و واضح ہو جائے گی کہ جدید شعرا کی صف میں جاں نثار اختر کا کیا مرتبہ و مقام ہے۔ مزید توضیح و تفصیل کی چنداں ضرورت نہیں۔

نہ اب ہے آب میں موتی نہ خاک میں سونا
مری طرح ہوئے خالی یہ بحر بر بھی کیا

(بانی)

آئی تھی اک صدا کہ چلے آؤ، اور میں
صحرا عبور کر گیا شوق فضول میں

(وزیر آغا)

---

[1] شاعر (ممبئی) ہم عصر اردو ادب نمبر ۱۹۷۷ء، ص ۳۰۹

رہ گیا مشتاق دل میں رنگ یاد رفتگاں
پھول مہنگے ہو گئے قبریں پرانی ہو گئیں

(احمد مشتاق)

سب راز کھل کے بکتے ہیں بازار میں مگر
ناقابل فروش ہماری ہی ذات ہے

(باقر مہدی)

ہونے کو یوں تو شہر میں اپنا مکان تھا
نفرت کا ریگ زار مگر درمیان تھا

(عادل منصوری)

ناگاہ اپنے سر پہ وہ دیوار گر پڑی
بیٹھا تھا ایک عمر سے جس کی پناہ میں

(ظفر اقبال)

جو شجر سوکھ گیا ہو وہ ہرا کیسے ہو
میں پیمبر تو نہیں میرا کہا کیسے ہو

(شہزاد احمد)

وقت بے وقت دستکوں کا عذاب
اور کیا مجھ کو میرا گھر دے گا

(محمد احمد رمز)

اخبار کے صفحات پر کیا ڈھونڈ رہے ہو
چہروں پہ بھی لکھی ہوئی تاریخ جہاں ہے

(بشیر بدر)

چھتیں تھیں بند دھواں اٹھ کے پھیلتا کیسے
ہوا نہ تھی تو اکیلا شرارہ کیا کرتا

(شمس الرحمن فاروقی)

خاک ہو کر بھی مہکتے ہیں گلابوں کی طرح
چند چہرے جو مقدس ہیں کتابوں کی طرح

(منیر انصاری)

ہے شہرتوں کی تمنا اگر تو ایسا کر
ہر ایک باب میں دنیا سے ہٹ کے سوچا کر

(نظام الدین نظام)

اس سفر کے سمندر میں چاروں طرف سہمی سہمی صداؤں کی بھرمار ہے
وقت کی موج سے بچ گئے بھی اگر، خون کی لہر ہم کو ڈبو جائے گی

(سلطان اختر)

وقت کے ذہن میں شاید میرا خاکہ ہی نہیں
اک خلاء ہو کہ تعین میرا ہوتا ہی نہیں

(غلام مرتضی راہی)

صحرا میں آگرا تھا کہیں سے جو برگ سبز
اس کو بھی اپنے ساتھ اڑالے گئی ہوا

(محسن زیدی)

کسی ویران جزیرے سے پکارو مجھ کو
میں کراہوں کے سمندر میں نکل آیا ہوں

(مظہر امام)

دیوار ہجر پر تھے بہت صاحبوں کے نام
یہ بستیٔ فراق بھی شہرت سرا ملی

(ساقی فاروقی)

احساس کا دکھ چھین لے نظروں کو بجھا دے
اس دور میں جینے کا مجھے کچھ تو صلہ دے

(بشر نواز)

ید بیضاء ، کاغذ عصا ہے قلم
مظفر غریبی کا پالا ہوا

(مظفر حنفی)

گھر کے اندر بے حسی کا رنگ ہے وہی
سورج آ کر کھڑکیوں سے جھانکتا کیا ہے

(پرکاش فکری)

حیراں ہیں کائنات کی بے تھاہ وسعتیں
انسان کا ذہن چند کتابوں میں دھنس گیا

(جاں نثار اختر)

شاید ہمارا نام و نسب یاد ہو انھیں
صدیاں جو سو رہی ہیں اندھیری گپھاؤں میں

(جاں نثار اختر)

رات ہی رات باہر کوئی جھانکے تو سہی
یوں تو آنکھوں میں سبھی خواب سحر رکھتے ہیں

(جاں نثار اختر)

جلنے والوں کی آہیں کہاں جل سکیں
اک دھواں سا ہے اب تک مکانوں کے بیچ

(جاں نثار اختر)

گزر گیا ہے کوئی لمحہ شرر کی طرح
ابھی تو میں اسے پہچان بھی نہ پایا تھا

(جاں نثار اختر)

زندگی تنہا سفر کی رات ہے
اپنے اپنے حوصلے کی بات ہے

(جاں نثار اختر)

زندگانی کی قدریں بدلنے لگیں
لوگ بٹنے لگے دو زمانوں کے بیچ

(جاں نثار اختر)

پاؤں اتنے تیز ہیں اٹھتے نظر آتے نہیں
آج تھک کر رہ گیا آدمی یہ مت کہو

(جاں نثار اختر)

راشد آذر نے جاں نثار اختر کی غزل پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے :

" پچھلے چند سال سے اردو غزل کے دو طرح کے نمونے قاری کی نظر سے گزرے ہیں۔ایک تو وہ ہیں جن میں کچھ اکھڑا اکھڑا سا انداز ہے جو نیا ہو یا نہ ہو لیکن اپنے کھدرے پن سے پہچانا جاسکتا ہے اور جس میں چونکانے یا جھنجھوڑنے کی بجائے جھٹکے دینے کی کیفیت ملتی ہے اور جس میں اکہری قسم کی باتیں سپاٹ انداز میں پیش کی جاتی ہیں۔دوسرے وہ نمونے ہیں جن میں جذبات کی مختلف سطحیں ذہن کے مختلف گوشوں سے تہیں کرید کر نکالی جاتی ہیں اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بے نقاب کیا جاتا ہے۔ پہلے نمونے وہ ہیں جن میں نہ

غزل کا آہنگ ہے نہ نظم کا رچاؤ ہے نہ رس، ورثہ ہے نہ آنے والے کل کی دھڑکن، صرف حال کا ایک ہی رخ ہے جس کو معلق کر دیا گیا ہے۔ دوسرے نمونے وہ ہیں جن میں ورثہ بھی ہے، مستقبل کی چاپ بھی اور حال کے دل کی دھڑکن بھی، جن میں آج کے سبھی رخ ہیں۔ کھرا کھوٹا حسین، بدشکل، غمگین، مسرت انگیز، درد سے چور اور خوشی سے سرشار۔۔۔ جاں نثار کی تازہ غزلیں دوسری تعریف میں آتی ہیں ان میں کلاسیکی ورثے کی زیرِ لب اظہار اور عصری زندگی کی بے باکی، دونوں کا بڑا حسین امتزاج ملتا ہے۔"[1]

چند مثالوں سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔

سوچو تو بڑی چیز ہے تہذیب بدن کی
ورنہ تو بدن آگ بجھانے کے لئے ہے

(جاں نثار اختر)

اسی سبب سے ہیں شاید عذاب جتنے ہیں
جھٹک کے پھینک دو پلکوں پہ خواب جتنے ہیں

(جاں نثار اختر)

دیکھوں تیرے ہاتھوں کو تو لگتا ہے تیرا ہاتھ
مندر میں فقط دیپ جلانے کے لئے ہے

(جاں نثار اختر)

وطن سے عشق غریبی سے بیر امن سے پیار
سبھی نے اوڑھ رکھے ہیں نقاب جتنے ہیں

(جاں نثار اختر)

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید اردو غزلوں کا جائزہ لیتے ہوئے ایک مقالہ میں لکھتے ہیں:

۱۔ خاک دل کا شاعر راشد آزر فن اور شخصیت ص ۵۰

"ایک عرصہ تک یہی سمجھا جاتا تھا کہ غزل کا میدان محدود اور موضوعات مخصوص ہیں لیکن آج کوئی موضوع ایسا نہیں جس کو غزل نے اپنی گرفت میں نہ لے لیا ہو۔ حسن و عشق و تصوف، غزل کے روایتی موضوعات ہیں لیکن غزل نے ان سے بغاوت نہیں کی ہے۔ ہم عصر اردو غزل میں حسن و عشق، گل و بلبل کی داستان، حکایت لب ور خسار اور سب کچھ ہے۔ لیکن جیسا کے ہمارے معاشرے میں حسن و عشق کا تصور بدل چکا ہے۔۔ ان کے آداب کچھ اور ہو چکے ہیں۔ ہم عصر اردو غزل میں بھی یہ تبدیلیاں در آئی ہیں۔ آج آنچل، پلو، دہلیز، نقاب، گھونگھٹ، جھروکہ، پازیب جیسے الفاظ اردو غزل میں کہاں ملتے ہیں۔ اس لئے کہ اردو معاشرے میں یہ چیزیں ہیں ہی کہاں؟ معاشرہ میں عورت کی بدلتی ہوئی حیثیت کے باعث، یہ ساری چیزیں قصہ پارینہ ہو چکی ہیں۔ اسی کے ساتھ سیاسی، معاشی اور تعلیمی قدروں کی تبدیلی کے نتیجے میں بلب، گیس، کیو، کار، بیڈ روم، ہوپ، نو، اسکوپ، لینڈ اسکیپ، بزنس، بک اسٹال، بریک، ہارن، کپ، روڈ، ایگزیبیشن، برتھ، اسٹیشن، سگنل، ریلوے، کراسنگ، جیسے بے شمار الفاظ ہمارے روزمرہ گفت و شنید میں رواں دواں ہیں۔ غزل میں حال حال تک فارسی الفاظ اور ترکیبیں رواں دواں تھیں۔ یہ تقاضائے وقت تھا۔ اسی طرح عصری حالات متقاضی ہیں کہ مندرجہ بالا الفاظ غزل میں مستعمل ہوں اور یہ غزل میں استعمال بھی ہو رہے ہیں۔" [1]

حالات کے تقاضوں اور ڈاکٹر صاحب موصوف کے مطالبوں کو پورا کرنے میں جاں نثار اختر بھی دوسرے جدید غزل گو شعرا کے دوش بدوش نظر آتے ہیں۔

ہائے یہ انتظار کے لمحے
جیسے سگنل پہ رک گئی ہو ریل

(جاں نثار اختر)

۱۔ شاعر (ممبئی) ہم عصر اردو ادب نمبر ۱۹۷۷ء ص ۳۰۲

چاندنی میں جل رہا تھا بیڈروم
نرم گدوں پر اکیلا چاند تھا

(عبدالرحیم نشتر)

رومال پر تھے پھول کڑھے، پات شال پر
دیکھا تھا میں نے کل اسے اک بک اسٹال پر

(ناصر شہزاد)

عصر حاضر کی غزلوں میں خطابیہ لب ولہجہ اکثروبیشتر پایا جاتا ہے۔ یعنی ایسی کیفیت نئی غزلوں میں مسلسل پائی جاتی ہے کہ کوئی سنے یا نہ سنے مگر کہنے والا اپنی بات کہتا چلا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جدید شاعر شکیل مظہری کی ایک غزل دیکھئیے۔

لفظوں میں اگر زہر کو بھر جاؤ گے لوگو
سوچو کہ ذرا خود بھی تو مر جاؤ گے لوگو

نکلو گے اگر دائرہ خوف کے باہر
اک دشتِ خموشی ہے کدھر جاؤ گے لوگو

اس موڑ پہ یاد آئیں گی سب اپنی خطائیں
جس موڑ پہ تم ہم کو بسر جاؤ گے لوگو

یادوں کے اجالے ہیں نہ زخموں کا اثاثہ
پھر کیسے شبِ غم سے گزر جاؤ گے لوگو

آنکھوں کی گزرگاہ سے ویرانۂ جاں تک
اک درد ہی پاؤ گے جدھر جاؤ گے لوگو

جاں نثار اختر بھی اس سلسلے میں جدید شعرا سے پیچھے نہیں ہیں۔

مزاج رہبر و راہی بدل گیا ہے میاں
زمانہ چال قیامت کی چل گیا ہے میاں

میں سوچتا تھا وطن جا کے پڑ رہوں گا کبھی
مگر فساد میں وہ گھر بھی جل گیا ہے میاں

جب انقلاب کے قدموں کی گونج جاگی ہے
بڑے بڑوں کا کلیجہ دہل گیا ہے میاں

ہمارے خواب بھی بہلا نہ پائے آج ہمیں
جو رو لیے ہیں تو کچھ دل بہل گیا ہے میاں

تمام عمر کی نظارگی کا حاصل ہے
وہ ایک درد جو آنکھوں میں ڈھل گیا ہے میاں

اب جاں نثار اختر اور چند دوسرے جدید غزل گو شعرا کے ہم مضمون و ہم معنی اشعار پیش کرتا ہوں تاکہ آپ کو یہ اندازہ ہو جائے کہ جاں نثار اختر کے بیان میں کتنی ندرت فکر ہے اور انھیں زبان و بیان پر کتنی قدرت حاصل ہے۔

خود اپنا عکس ہوں کہ کسی کی صدا ہوں میں
یوں شہر تا بہ شہر جو بکھرا ہوا ہوں میں

(خلیل الرحمٰن اعظمی)

بکھر گیا ہے کچھ اس طرح آدمی کا وجود
ہر ایک فرد کوئی سانحہ لگے ہے مجھے

(جاں نثار اختر)

بہت قریب کھڑے ہیں اٹے ہوئے ہیں بدن
ہوس کو اب بھی گماں ہے کہ فاصلہ سا ہے

(بمل کرشن اشک)

میں تیری ذات میں گم ہو سکا نہ تو مجھ میں
بہت قریب تھے ہم پھر بھی فاصلہ تو رہا

(جاں نثار اختر)

کیا جانیے منزل ہے کہاں جاتے ہیں کس سمت
بھٹکی ہوئی اس بھیڑ میں سب سوچ رہے ہیں

(شکیب جلالی)

کیا پتہ پہنچیں گے کب منزل تلک
گھٹتے بڑھتے فاصلوں کا سایہ ہے

(جاں نثار اختر)

خواہشیں کیڑے مکوڑوں کی طرح مرنے لگیں
خود کشی کی وارداتوں کا یہ منظر تو بھی دیکھ

(عتیق اللہ)

ارماں ہمیں اک رہا ہو تو کہیں بھی
کیا جانے یہ دل کتنی چتاؤں میں جلا ہے

(جاں نثار اختر)

جو ساتھ لے کے چلا تھا ہزار ہنگامے
وہ شخص آج اکیلا دکھائی دیتا ہے

(خورشید احمد جامی)

جو اپنی ذات سے اک انجمن کہا جائے
وہ شخص تک مجھے تنہا دکھائی پڑتا ہے

(جاں نثار اختر)

کل رات یوں ہوا کہ پہر دوپہر گئے
کوئی کچھ ایسے چونک پڑا لوگ ڈر گئے

(بمل کرشن اشک)

وہ کون سی آہٹ تھی جو خوابوں میں در آئی
کیا جانیے کیوں چونک پڑے پچھلے پہر ہم

(جاں نثار اختر)

جہاں تک لفظیات شعری کا تعلق ہے جاں نثار اختر اس میں بھی کسی جدید شاعر سے پیچھے نہیں۔ انھوں نے لفظیات شعری خود بنائی ہے۔ لکھنو کی غزلوں کی لوچ و لچک اور جدیدیت کی حرارت نے جاں نثار اختر کی لفظیات شعری میں ایک اہم رول ادا کیا ہے اگر ایک جانب انھوں نے کلاسیکی تراکیب کو اپنی لفظیات شعری میں جگہ دی ہے تو دوسری طرف گلی، بازار، اخبار، رسائل، اور روزمرہ کو بھی اپنی لفظیات شعری میں بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ سمویا ہے علاوہ ازیں ہندی کی بہت سی تراکیب اور الفاظ استعمال کر کے شاعری میں غنائیت اور ترنم پیدا کیا ہے۔ لیکن جاں نثار اختر جس شہرت اور مرتبہ و مقام کے مستحق تھے وہ مقام ابھی تک انھیں نہیں مل سکا ہے۔

بہر کیف پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، پروفیسر آل احمد سرور، شاذ تمکنت اور حسن نعیم کی درج ذیل تحریروں سے میرے اس بیان کی تصدیق ہو جائے گی کہ جاں نثار اختر جدید اردو شعرا کی صف میں ایک ممتاز و منفرد نمایاں اور معتبر مقام رکھتے ہیں اور اب ان کو یہ گلہ نہیں رہے گا کہ ۔

اس عہد بصیرت میں بھی نقاد ہمارے
ہر ایک بڑے نام سے مرعوب رہے ہیں

"اختر نے نئی غزل کے ذریعہ نہ صرف اس کا رشتہ ادبی تاریخ سے پھر جوڑا بلکہ اس کو ایک نئی شش جہت، نئی معنویت، نئی حسیت، نئی لفظیات اور نئی دل کشی عطا کی۔ اس اعتبار سے غزل کی عصری تاریخ میں ان کی حسیت سنگ میل کی سی ہے۔ ان کی غزلیں صاف عصر حاضر کی چیز معلوم ہوتی ہیں۔" (پروفیسر خواجہ احمد فاروقی)

"جاں نثار اختر کا دل نئی نسل کے احساس کے ساتھ دھڑکتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ جاں نثار کی شاعری آج بھی جوان ہے۔ کیونکہ ان کی شاعری نئی فکر، نئی حسیت اور تازہ ترین میلانات کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔" (پروفیسر آل احمد سرور)

"جاں نثار اختر نے نئی غزل کے امکانات کو آج کے مروجہ سکہ بند الفاظ سے نہیں چمکایا۔ مثلاً سورج، سمندر، ریت، جسم، سایہ، تنہائی، ذات کے اندر، ذات کے باہر، پیاس، پیڑ، باہر، پتے، گھاس اور نہ جانے کتنے ہی لفظ آج کی پچھتر فیصدی ناکام غزلوں میں ملتے ہیں۔ ان تمام لفظوں سے جاں نثار اختر نے اس لئے شعوری اور غیر شعوری طور پر پرہیز کیا ہے کہ ان کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے۔ جہاں شاعر کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہو لفظیات کا در خود بخود کھل جاتا ہے۔ ہمارے اکثر و بیشتر نئی غزل کے شاعر اس نکتہ کو فراموش کر جاتے ہیں کہ حسن و معنی کو مشاطگی کی ضرورت نہیں پڑتی ہمیشہ فطرت کی حنابندی خود کرتی ہے۔ اگر جذبہ شدید ہو اور دل کی گہرائیوں سے نکلا ہو تو سامنے کے لفظ بھی جادو بن کر بولنے لگتے ہیں۔ نئی غزل کے مروجہ نئے ڈکشن کے ساتھ وہی خطرہ لاحق ہو چلا ہے جو ترقی پسند شاعری کی یکسانیت کا سبب بنا تھا۔ ظلمت اندھیرا، صبح شجر، دار و رسن، مقتل زنداں، وغیرہ جیسے الفاظ کس قدر جلد کھوکھلے ہو گئے یہ آپ کے اور ہمارے سامنے کا حادثہ ہے۔" (شاذ تمکنت)

"ترقی پسند قافلہ کے ایک اہم شاعر جاں نثار اختر ہیں۔ جنھوں نے گزشتہ چار پانچ

برسوں میں وہ غزلیں کہی ہیں۔ جو ''پچھلے پہر'' میں شامل ہیں۔ یہ غزلیں باقی تمام ترقی پسند شاعروں کی غزلوں سے بہ اعتبار مزاج و مواد مختلف ہیں۔ بلکہ فکری اور موضوعی اعتبار سے جدید تر نسل کی غزلوں سے زیادہ قریب ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے اہم اور قابل لحاظ بات یہ ہے کہ جاں نثار اختر پہلی بار اپنی انفرادیت کو بروئے کار لانے میں کامیاب ہوئے ہیں اور ان کی حسن بیں نگاہوں نے ایک دل کش رنگ تغزل کا جلوہ دکھایا ہے۔ ایسے خیالات واحساسات جن کے بھرپور اظہار پر نمایندہ نئے شعرا کو قدرت حاصل نہیں ہے۔'' (حسن نعیم)

جاں نثار اختر کی شخصیت

اور ان کا فن

کہا جاتا ہے کہ شاعری شخصیت کا آئینہ ہے یہ قول خاصہ گمراہ کن ہے۔ جس طرح آئینہ میں کسی شیشے کا عکس نظر آتا ہے اسی طرح شخصیت کا عکس شاعری میں نظر نہیں آتا۔ نہ شخصیت اتنی سادہ اور واضح شے ہے اور نہ شاعری اتنی شفاف اور ہموار سطح رکھتی ہے کہ ہمیں شاعر کی شخصیت اس کے کلام میں بجنسہ نظر آئے۔ شخصیت شاعری میں ضرور جھلکتی ہے مگر اس پر شاعری کے مخصوص اظہار اور فن کے تقاضوں کا پردہ ہوتا ہے۔ کسی شاعر کی شخصیت کا مطالعہ اس کے کلام سے کرنے کے لئے ماہر نفسیات ہونا کافی نہیں۔ شاعری کے آداب سے واقف ہونا بھی ضروری ہے۔ نفسیات کا علم ہمیں شخصیت کی خصوصیات سے آگاہ کرتا ہے۔ اس کی نوعیت بتاتا ہے، اس کے میلان یا جھکاؤ سے واقف کراتا ہے۔ مگر شاعری جس طرح شخصیت کو ظاہر کرتی ہے وہ اس کا اپنا طریقہ ہے۔ یہ ایک طلسمی دنیا ہے جس میں کہیں بہت تیز روشنی اور کہیں بہت گہری تاریکی ہے۔ یہاں آوازیں حقیقی نہیں، ملی جلی ہیں۔ ہر آواز شاعر کی نہیں ہے اور کوئی آواز شاعر کی لے سے محروم نہیں ہے، شاعر کی آواز میں

بھی بہت سی پچھلی آوازوں کی گونج ہے پھر شاعری کی کچھ روایات ہیں۔ یہ روایات فکر کی بھی ہیں اور فن کی بھی۔۔۔ وہ شاعر بھی جو انفرادیت رکھتے ہیں اور جن کا رنگ صاف پہچانا جاتا ہے فکر و فن کی روایات کی ترمیم و تنسیخ۔ تنظیم نو یا ترتیب نو سے اپنے آپ کو ممتاز کرتے ہیں۔ اس لئے شاعری میں شخصیت کا مطالعہ خاصہ دل چسپ اور مفید مگر مشکل کام ہے۔ اس کے لئے سب سے پہلے شاعری کی آوازوں سے مانوس ہونے کی ضرورت ہے۔ شاعری کی فضا سے آشنا ہونا۔ شاعر سے ذہنی ہمدردی پیدا کرنا، تحسین (Appreciation) کے فرائض سے عہدہ بر آ ہونا۔ شاعری کی اپنی حقیقت اور اس کے اپنے قواعد کو جاننا ضروری ہے اور علمی طریقہ کار میں بھی لچک دار ذہن پیدا کرنا لازمی ہے۔"

"اس گفتگو کا مقصد یہ ہے کہ شاعر کی شخصیت اگرچہ شاعری میں براہ راست نہیں آتی اور فکر و فن کے آداب کی پابندیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ مگر مضامین کی تکرار، الفاظ کی تکرار، جزئیات کی تفصیل، تراکیب، استعاروں، تلمیحوں، اور اشاروں اور کنایوں میں اتنی باتیں اور اتنے رخ ہوتے ہیں کہ ان کا مطالعہ ہمیں ایک سمت اور منزل کی طرف لے جاتا ہے ہاں اس کے لئے شاعری کے مخصوص اسلوب اور طریقہ کار سے آگاہی ضروری ہے ورنہ بیگانگی سے عمل جراحی اس کی لطافتوں کا خون کر سکتا ہے اور پھر مطالعہ کرنے والوں کو پوری اور جیتی جاگتی شخصیت نہیں بلکہ اس کے اجزا ہاتھ لگتے ہیں۔ یہاں یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ بڑی شاعری صرف شخصیت کا مظہر نہیں ہوتی، غیر شخصی بھی ہوتی ہے۔ کیونکہ اسی سے اس کی آفاقیت کے جوہر کھلتے ہیں۔ ہاں غیر شخصی عناصر میں عمومی اثرات کی دھوپ چھاؤں سے ہی شاعری کی جنت عبارت ہے۔" (پروفیسر آل احمد سرور)

جاں نثار اختر کے ابھی تک جتنے شعری مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ان کی روشنی میں ان کی شخصیت و شاعری کا جائزہ لیا جائے تو زیادہ مناسب اور اہم ہو گا۔ اب تک ان کے نو (۹) شعری مجموعے شائع ہو کر عوام الناس میں شہرت دوام حاصل کر چکے ہیں۔ مجموعوں کے نام یہ ہیں۔ (۱) سلاسل (۲) تار گریباں (۳) جاوداں (۴) نذر بتاں

(۵) شکست خوں (۶) گھر آنگن (۷) خاک دل (۸) پچھلے پہر (۹) امن نامہ (مثنوی) ان مجموعوں کے علاوہ کچھ دوسرے مجموعے بھی ہیں جنھیں فن کار نے خود ترتیب دیا ہے ان میں "زیرلب" "ہندوستان ہمارا" اور "حرف آشنا" قابل ذکر ہیں۔

جاں نثار اختر کی شخصیت اور شاعری کو بخوبی سمجھنے کے لیے ان کی اہلیہ محترمہ صفیہ کے خطوط کا مطالعہ کرنا بھی ضروری ہے صفیہ کے خطوط سے اختر کی شخصیت اور شاعری کے بہت سے پہلوؤں کی نقاب کشائی ہو جاتی ہے۔ گویا "زیرلب" اور "حرف آشنا" کا مطالعہ کیے بغیر کوئی بھی شخص جاں نثار اختر کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکتا۔ اختر کی شاعری کا آغاز اردو کے بیشتر شعرا کی طرح غزل سے ہوا۔ وہ ۱۹۳۵ء تک بالکل روایتی اور عاشقانہ انداز کی غزل کہتے رہے۔ پھر ہم عصر شعرا کی پیروی میں رومانی وجذباتی طرز کی نظمیں لکھنا شروع کردیں۔ لیکن بہت جلد انھوں نے اپنے ذہن اور شاعری کو ایک نئی راہ پر لگادیا۔ جس طرح جاں نثار اختر کی شخصیت میں نرمی، لطافت زبان کی ملائمیت، خلوص، پیار، نفاست، اور محبت کی جلوہ گری نظر آتی ہے اسی طرح انکی شاعری میں بھی یہی احساس اور یہی لب ولہجہ پایا جاتا ہے۔ یعنی ان کی پوری زندگی اور شاعری کا سرمایہ کلی، انہی چیزوں سے عبارت ہے جن کا ذکر سطور بالا میں آچکا ہے۔

جاں نثار اختر کو ہم ہندوستان کی سرزمین کا ایک کامیاب نمائندہ شاعر کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ ان کی شاعری میں جتنی ہندوستانیت اور مقامیت پائی جاتی ہے وہ ان کے معاصرین شعرا میں سے کسی میں نہیں پائی جاتی۔ ان کی شاعری میں ہندوستان کی سوندھی مٹی کی بوباس ہے ان کی کوئی بھی نظم خواہ وہ "اتحاد" ہو "امن نامہ" ہو یا کوئی اور نظم۔۔۔ تقریباً تمام نظموں میں اپنے دیش اور اپنے وطن سے والہانہ پیار صاف جھلکتا ہے۔ گوکہ جاں نثار اختر ہر جگہ وطن پرستی کے جذبہ سے سرشار نظر آتے ہیں اور یہ باتیں صرف ان کی نظموں تک ہی محدود نہیں۔ بلکہ ان کی غزلوں میں بھی یہی خصوصیت پائی جاتی ہے۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں جو استعارے، تشبیہیں اور کنایے استعمال کیے ہیں وہ ایک دم

ہندوستانی ہیں۔ ان کی رباعیات کا مجموعہ ''گھر آنگن'' کا بہ نظر غائر مطالعہ کیجئے تو اندازہ ہو جائے گا کہ ان کی رباعیوں میں عورت کی جو تصویر کشی کی گئی ہے وہ خالص ہندوستانی عورت کی تصویر ہے۔ ان رباعیوں کے مطالعہ سے ہندوستانی عورت کا ہیولی واضح شکل میں ابھر کر ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ مثلاً ہندوستانی عورتوں کا رہن سہن، ان کے عادات و اطوار، ان کے ملبوسات، ان کی وضع قطع اور ان کے اندر ماں کی ممتا اور شوہر پرستی کا جو غالب جذبہ موجود ہے وہ سب ان کی رباعیوں میں پوری طرح منعکس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کے مشہور و ممتاز شاعر اور نقاد فراق گورکھپوری نے بھی ان کی رباعیوں کے مجموعے ''گھر آنگن'' کی یوں تعریف کی ہے :

''میں نے جاں نثار اختر کی حسین و جمیل رباعیوں کا گلدستہ جو ''گھر آنگن'' کے نام سے شائع ہوا ہے نہایت لطف اندوز ہو کر کئی بار پڑھا۔ ان رباعیوں میں ہندوستان کے اندازاً پندرہ (۱۵) کروڑ گھروں اور گھریلو زندگی کی نرم نازک جھلکیاں دکھائی گئی ہیں۔ ان رباعیوں میں ادھ کھلی کلیوں اور ان کی بھینی بھینی خوشبوؤں کی صفت رچی اور بسی ہوئی ہے۔ ہندوستان کی تمام زبانوں کے لوک گیت کی گونجیں اور جھنکاریں رہ رہ کر سنائی دے جاتی ہیں۔ ان رباعیوں میں ایک کنوارا پن ہے جسے ہم کسی موہنی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ کنوارے پن کی یہ تازگی ان رباعیوں کو سدا ابہار اور سدا سہاگ بنا دیتی ہے۔ ''گھر اور آنگن ہندوستانی تہذیب کے ہنڈولے ہیں۔ انہی پالنوں میں یہ رباعیاں ہلکے ہلکے جھکولے لے رہی ہیں۔ ایسی شاعری ہمارے لوک گیتوں میں بھرپور انداز سے پیش کی گئی ہیں۔ بلند اور شاندار ادب میں یہ موضوع اور اس کے ہزاروں پہلو ''سورداس'' کے پدوں میں دکھائے گئے ہیں۔ جاں نثار اختر نے یہی نعمت ہمیں ان رباعیوں میں دے کر ہم سب پر بڑا احسان کیا ہے۔''

جاں نثار اختر کی شخصیت اور شاعری پر بحث کرتے ہوئے اردو کے ممتاز ناقد ڈاکٹر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں :

''جاں نثار اختر کی شخصیت میں ایک خاص طرح کی کشش اور معصومیت تھی جوان

سے ایک بار مل لیتا وہ ان کا گرویدہ ہو جاتا۔ جاں نثار اختر کی نئی غزل کی بدولت ان کی پوری شاعری از سر نو توجہ کا مرکز بن گئی ہے۔ وہ ایک اچھا امتزاجی ذہن رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے عہد کے بہترین اثرات کو جذب کیا اور نئی نسلوں سے اپنا ذہنی رشتہ استوار کر لیا۔ انھوں نے جہاں اچھی ڈائریکٹ نظمیں کہیں وہاں بہت اچھی غزلیں بھی کہیں اور غزل کی اچھی شاعری ڈائریکٹ شاعری نہیں ہوتی۔ یقین سے شک کے سفر نے ان کی شاعری کو پایہ اعتبار بخشا کیونکہ روایتی سچائی سے وہ سچائی زیادہ اثر آفریں ہوتی ہے جو شک کے بطن سے پیدا ہو۔ مثلاً۔

جو ایک سمت گماں ہے تو ایک سمت یقیں
یہ زندگی تو یونہی درمیاں چلے ہے میاں

جاں نثار اختر کی شاعری آورد کی شاعری نہیں آمد کی شاعری ہے۔ ان کی شاعری میں ہر مقام پر ایک لطیف روحانی فضا ملتی ہے اور نشاط کرب کا بھی شدید احساس ہوتا ہے۔ ان کی شاعری کے اور تمام عناصر میں استعاراتی عنصر کو خاص اہمیت حاصل ہے کیونکہ یہ ان کی شاعری کا بڑا اہم اور روشن پہلو ہے۔ جاں نثار اختر کے یہاں تہذیب عاشقی کا ایک خاص سلیقہ ملتا ہے۔ چنانچہ حسرت موہانی اور جگر مراد آبادی کے بعد اس اعتبار سے جاں نثار اختر کا نام دنیائے اردو شاعری میں زندہ و تابندہ رہے گا۔ اردو کے جن شعرا نے شاعری کو آرٹ سے قریب تر اور ہم آہنگ کرنے میں شعوری کوشش کی ہے۔ ان میں ایک نام جاں نثار اختر کا بھی ہے۔ یہ بھی شاعری کو آرٹ کا درجہ عطا کرنے والوں میں سے تھے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے بعض اشعار، اشعار نہیں بلکہ بے حد حسین اور خوبصورت مصوری (Painting) معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری ان کی زندگی سے عبارت ہے۔ ان کی شاعری میں جو نرمی، کلاسیکی رچاؤ اور جمالیاتی حس برقرار ہے۔ اس کے پیش نظر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ کلاسیکی روایات کے امین، ترقی پسند رجحانات کے علم بردار اور عصری آگہی و جدید حسیت کے بہترین رمز شناس تھے اور یہ بھی صحیح ہے کہ جاں نثار اختر رومانیت کے علمبرداروں میں سے ایک تھے لیکن ان کی رومان پسندی ایک ممتاز خصوصیت کی حامل تھی۔ مثلاً اختر شیرانی کی رومانیت

پسندی اور جاں نثار اختر کا رومانوی رجحان ایک دوسرے سے یکسر مختلف تھا۔ اختر شیرانی کی رومانیت میں یہ بات تھی کہ اس کو پڑھنے والا اپنے معاشرے اور سماج سے خود کو الگ کرنے کے متعلق سوچتا تھا۔ لیکن جاں نثار اختر کا رومان اس کے برعکس تھا۔ کیونکہ ان کی رومانیت سے متاثر ہونے والا ایک نئے عزم اور استقلال کے ساتھ زمانے کو تبدیل کردینے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ یوں تو انھوں نے سیاسی نظمیں بہت کم لکھیں اور اگر لکھیں بھی تو ان میں ان کا انفرادی رنگ ابھر نہیں سکا ہے۔ حالانکہ ان کے بعض فلمی گیتوں میں ان کا کلاسیکی رچاؤ اور ادبی آہنگ واضح طور پر نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری پروپیگنڈہ کی شاعری ہرگز نہیں کہی جاسکتی وہ ادب میں اشتہار بازی اور پروپیگنڈہ وغیرہ کے مخالفوں میں سے تھے یہی وجہ ہے وہ زوردار لہجے میں گرج گرج کر انقلاب زندہ باد اور انقلاب پائندہ باد وغیرہ جیسے نعرے نہیں لگاتے۔ ان کی شاعری میں کافی تنوع پایا جاتا ہے۔ وہ اکثر و بیشتر مقامات پر کیمرہ آرٹ کا استعمال بڑی خوش اسلوبی سے کرتے ہیں۔ انکی شاعری کا حسن اور فنکارانہ کمال یہ ہے کہ وہ ماحول کی جذباتی عکاسی اور خوبصورت منظر کشی بڑے حسین و دل کش انداز بیان میں کرتے ہیں۔

جاں نثار اختر کی سیاسی، سماجی اور ادبی زندگی نے جہاں ان کی شاعری میں ایک طرف عمل کی حرارت پیدا کردی ہے۔ وہاں دوسری جانب اسے حسن و عشق کی شبنمی ٹھنڈک بھی عطا کی ہے اور بلاشبہ یہی شاعر کو میدان عمل میں کود جانے کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔ علاوہ ازیں جہاں تک جاں نثار اختر کی شاعری کے موضوعات کا تعلق ہے وہ بنیادی طور پر انسانی محبت سے معمور ہیں۔ انھیں انسان سے ہمدردی اور بے پناہ پیار ہے اور یہی وہ محبت ہے جو سماجی شکل میں ''غم جاناں'' سے شروع ہو کر ''غم دوراں'' کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ پھر وہ بڑی خوبصورتی کے ساتھ فرد اور سماج کے آپسی تعلق پر کھل کر اظہار خیال کرتے ہیں۔ البتہ کبھی کبھی ایسے مواقع بھی آتے ہیں جہاں فرد اور سماج اپنی اپنی انفرادیت کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں اور ایسے مقامات پر وہ فرد واحد کی محبت کو سماج کی محبت پر نثار کردیتے ہیں۔ مثلاً

کون ساگیت سنو گی "انجم" اور "زندگی" وغیرہ نظموں میں انہی کیفیات واحساسات کااندازہ ہوتا ہے۔ گویا یہ ثابت ہوگیا کہ جاں نثار اختر بنیادی طور پر محبت کا شاعر ہے اور امن وسلامتی اور محبت اس کے پسندیدہ موضوعات ہیں۔ جاں نثار اختر کی شخصیت اور شاعری دونوں رومان پرور ہیں۔ ان کی شاعری میں "ناہید" اور "انجم" جیسے بہت سے نام صنف نازک کے ملتے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ یہ نام فرضی ہوں۔ بہر حال یہ نام فرضی ہوں یانہ ہوں۔ لیکن یہ حقیقی امر ہے کہ ان کی شخصیت اس عالم رنگ و بو کی تمام جلوہ سامانیاں لئے ہوئے ہے۔ جنکی حسین یادوں سے شاعر کے ذہن میں حسن تخلیق کی کلیاں چٹکتی رہی ہیں اور یہی تجربے شعریات میں شدت اور تحریک پیدا کردیتے ہیں۔ جاں نثار اختر کی رومانی تخلیقات میں خلوص، درد، ترنم اور کیف کا جو احساس پایاجاتا ہے وہ ان کی یادوں کا رہین منت ہے انگریزی زبان کے مشہور شاعر ورڈس ورتھ (Wordsworth) نے ایک مقام پر شاعری کے متعلق رقم کیاہے کہ (Poetry is thoughts recollected in tranquility) اور یہاں پر ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ جاں نثار اختر کی رومانی شاعری پر ورڈس ورتھ (Wordsworth) کامذکورہ بالا قول چسپاں ہو جاتا ہے۔

جاں نثار اختر کی شخصیت اور شاعری پر بحث کرتے ہوئے راشد آذر نے ایک مضمون میں لکھاہے:

"جدلیاتی مادیت کے فلسفے (جس سے جاں نثار اختر متاثر تھے) کی روشنی میں ہم جاں نثار اختر کی شاعری کو سمجھنے کی کوشش کریں تو ایک ہی شاعر کے مختلف اوقات میں مختلف موڈ ہمارے سامنے صاف طور پر آجاتے ہیں۔ کیونکہ انسانی ذہن اور جسم کی ساخت کسی مجرد اور صاف تصور کے تحت عمل میں نہیں آتی۔ اس کا ارتقا جدلیاتی اصولوں کے تحت ہوتا ہے۔ جس میں مقداری تبدیلی ماہیتی تبدیلی کو جنم دیتی ہے اس طرح جاں نثار اختر عاشق، حسن پرست، مشفق باپ، بیوی سے محبت کرنے والے اور بیوی کو ہر روپ میں دیکھنے والے شوہر، اپنے آپ کو بحیثیت شوہر بیوی کی نظروں سے جانچنے والے فرد، سماجی ارتقا پر نظر

رکھنے والے مفکر، فن پر گرفت رکھنے والے شاعر اور بچپن کی معصومیت برقرار رکھنے والے بزرگ دوست کے روپ میں دکھائی دیتے ہیں۔ جس طرح ہم ایک ہی شخص کو ایک اچھے شوہر، باپ اور سماجی فرد کے روپ میں دیکھ سکتے ہیں اسی طرح مارکسی نظریہ ادب ہم کو یہ بھی سکھاتا ہے کہ ہم ایک اچھے حسن پرست عاشق شاعر سے اس بات کی توقع رکھیں کہ یہ ایک سماجی ذمہ داری قبول کرنے والا شاعر بھی ہو یا سیاسی موضوعات پر لکھنے والے شاعر سے توقع رکھیں کہ وہ ایک عاشق مزاج، حسن پرست، اولاد سے محبت کرنے والا باپ اور بیوی کو محبوبہ سمجھنے والا شاعر بھی ہو۔"

"جاں نثار اختر نے اردو کو جہاں تازہ اور خوبصورت غزلیں دی ہیں وہاں بڑی خوبصورت نظمیں اور رباعیاں اور قطعے بھی دیے ہیں جو "خاک دل" اور "گھر آنگن" کی صورت میں ہم دیکھ سکتے ہیں اور جن پر اردو ہی نہیں کوئی بھی زبان ناز کر سکتی ہے۔ غزلوں قطعوں اور رباعیوں میں جاں نثار اختر جذبات کی مختلف سطحیں ذہن کے مختلف گوشوں سے تہیں کرید کر نکالتے اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بے نقاب کرتے تھے۔ ان کی تخلیقات میں ورثہ بھی ہے مستقبل کی چھاپ بھی اور حال کے دل کی دھڑکن بھی۔ ان تخلیقات میں آج کے سبھی رخ میں کھرا کھوٹا، حسین، بدشکل، غمگین، مسرت انگیز درد سے چور اور خوشی سے سرشار ان میں کلاسیکی ورثے کے زیر لب اظہار اور عصری زندگی کی بے باکی دونوں کا بڑا حسین امتزاج ملتا ہے۔ جاں نثار اختر کو عشقیہ نظم گو یا غزل گو یا سماجی موضوعات پر شعر کہنے والے شاعر کے خانوں میں تقسیم کرنا، ان کی رنگا رنگ طبیعت کے ساتھ ظلم ہے۔ ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو ایک غیر منقسم اکائی سمجھ کر دیکھیں تو ہم کو اندازہ ہوگا کہ جاں نثار اختر ایک بھرپور شخصیت کا نام تھا۔ اس طرح دیکھنے سے ہم پر فن اور فنکار کے باہمی رشتے کے کئی جدلیاتی راز بھی افشا ہو جائیں گے جو شاعر کو خانوں میں بانٹ کر اکہرے انداز سے سوچنے والے نقاد عام طور پر سمجھ نہیں پاتے اور یہ بات ان کے لئے معمہ بن جاتی ہے کہ حسن پرست شاعر انقلابی بھی ہو سکتا ہے۔ حقیقت ضدین کی اکائی میں ہے۔ محض یک رنگی میں

نہیں۔اس طرح جاں نثار اختر کی شخصیت کی اکائی۔ ضدین کے اتحاد کو جانچ کر سمجھی جا سکتی ہے اوران کی شخصیت کو سمجھنے کے لئے لفظ "محبت" کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنا ضروری ہے کیونکہ "محبت" کا دوسرا نام جاں نثار اختر تھا۔"[1]

زیر نظر اقتباس سے جاں نثار اختر کی شخصیت اور شاعری پر کافی گہری روشنی پڑتی ہے۔ بہر کیف، جاں نثار اختر کی شاعری کی سب سے بڑی اور اہم خصوصیت میرے نزدیک یہ ہے کہ ان کی شاعری، ان کی شخصیت اور کردار کا ہو بہو عکس ہے۔ کیونکہ ان کی شاعری ہر طرح کے عیب اور فریب سے پاک ہے۔ان کی شاعری بالکل سیدھی اور بچی فارمولے کی شاعری ہے۔ ہر شاعر کش مکش و تصادم کے زیر اثر گزری ہوئی اس حیات میں اپنے لئے اپنی ایک علاحدہ کائنات کی تخلیق کرتا ہے اور بلاشبہ اختر بھی ویسے ہی شعرا میں سے ایک تھے۔ جنھوں نے اپنی ایک الگ دنیا بنائی تھی۔انھوں نے اپنا ایک منفرد و ممتاز لب ولہجہ اپنایا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جاں نثار اختر اپنے کئی ہم عصر شعرا سے ممیز و ممتاز نظر آتے ہیں۔ان کی آواز میں جو ایک ہلکا سا ارتعاش پایا جاتا ہے اس کو اگر ہم انسانی ضمیر کی آواز سے تشبیہ دیں تو غلط نہ ہوگا۔ان کی یہ آواز یاس و ناامیدی اور محرومی کے سائے تلے پلنے والے لوگوں کے لئے امید و بیم کے آفتاب کی ایک تیز شعاع کا کام دیتی ہے۔ جس سے محرومیوں کا مارا ہوا انسان بھی اپنے نئے عزم کے ساتھ پھر اپنی منزل کی سمت گامزن ہو جاتا ہے۔

فن کے دو بنیادی پہلو ہیں۔ پہلا ہئیت اور دوسرا حسن یعنی یہ ایسی قدریں ہیں جن کی شکل اور اثر تغیر پذیر اور متنوع اہمیت کے حامل ہیں۔ جاں نثار اختر کا نظام فن ہر عظیم فن کار کی طرح مخصوص، ممتاز اور منفرد معلوم ہوتا ہے۔ان کی شاعری کی دنیا ان کے معاصرین سے الگ دنیا کی حیثیت رکھتی ہے اور ان کی شاعری کی اپنی ایک خاص فضا ہے اور اس دنیا میں بسنے والے الفاظ اپنا ایک منفرد اور ایک امتیازی شان رکھتے ہیں۔ جاں نثار اختر نے اردو شاعری کی روایت سے نہ تو بغاوت کی اور نہ تو روایت کی کورانہ تقلید ہی کی۔ بلکہ انھوں نے

۱۔ فن اور شخصیت (ممبئی) ص ۶۰۔۵۸

اردو شاعری میں ایک نیا انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی ہے۔ گویا وہ روایت اور بغاوت کے درمیان ایک متوازن لکیر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس طرح جاں نثار اختر کو روایت اور بغاوت کا امین کہنا غالباً بے جا نہ ہوگا۔ انھوں نے ایجاد و اختراع اور اخذ و جذب کے ذریعے روایت اور بغاوت کی ساری زنجیریں ایک دوسرے سے کھینچ کر بالکل ملا ڈالی ہیں جس طرح ان کی فکر میں پختگی پائی جاتی ہے۔ اسی طرح ان کا فن بھی بے حد بالیدہ اور پختہ ہے۔ علاوہ ازیں شعور کی بے شمار گرہوں اور تہوں کی بہترین ترجمانی ان کے یہاں ملتی ہے۔ انھوں نے شاعری کے فنی تسلسل کو برقرار رکھا اور آہستہ آہستہ فنی اعتبار سے آگے بڑھتے رہے۔ یہی جاں نثار اختر کے فن کی عظمت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ ہمارے جدید شعرا فن کے اس گر سے قطعی طور پر بے بہرہ اور ناواقف ہیں۔ جاں نثار اختر نے نئے فنی نقوش کو انتہائی خوب صورت انداز میں ابھارا ہے ان کے یہاں ندرت فکر اور جدت طرازی کے جو نمونے ملتے ہیں وہ بالکل قدرتی معلوم ہوتے ہیں۔ اس میں تصنع کا شائبہ تک نہیں۔ انھوں نے جن اجنبی نقوش کو اپنی شاعری میں پیش کیا ہے اس کے لئے انھوں نے ضروری فنکارانہ صلاحیتوں سے کام لیا ہے تاکہ نامانوسیت اور اجنبیت کا خاتمہ ہو جائے اور اپنا پن کا احساس ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی جدت و اختراع کا خیر مقدم بیشتر ناقدین ادب نے کیا ہے۔

جاں نثار اختر نے اپنی شاعری میں قدیم و جدید علوم اور روایات کا احترام کیا ہے اور اسے بہتر سے بہتر طور پر برتنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔ بعض دفعہ انھوں نے موضوع کو مد نظر رکھا ہے اور کبھی علامات کو۔۔۔ جاں نثار اختر کے فن کو سادہ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اس میں تمام پیچیدگیاں سمٹ آئی ہیں اور یہاں ان مسائل کی جھلکیاں موجود ہیں جن سے عصر حاضر کا ہر انسان خواہ شعوری یا لاشعوری طور پر ہی سہی۔ مگر دست و گریباں ضرور ہے۔ فکر کی انہی پیچیدگیوں اور مسائل کو فن بنانے کی خاطر شعرا کو رمز و ایماء اور علامات کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ یعنی حقیقتوں کو افسانہ بنا دینا جاں نثار اختر کے فن کی اصل حقیقت و کمال ہے۔ دنیا کے حقائق کو افسانہ کی شکل میں پیش کرنے کے لئے جاں نثار اختر نے تلمیحات اور

علامات کا تانا بانا بنا رکھا ہے۔ اس لئے جاں نثار کے فن سے پورے طور پر لطف اندوز ہونے کے لئے لازمی ہے کہ قاری و سامع ذہین، عالم اور باصلاحیت ہو۔ جاں نثار اختر کے مزاج میں فن کی نغمگی اس حد تک رچ بس گئی تھی کہ زبان و کلام محض موزوں و مقفیٰ نہیں بلکہ مترنم بھی نکلتا تھا۔ اس ترنم سے بھرپور لے کا کچھ حصہ تو روایتی ردیف و قافیہ کا ہے۔ لیکن فن کے نشاط انگیزی کا یہ معاملہ ترنم تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ شعر کی اصل روح ولولہ ہوتا ہے۔ ایک قسم کا والہانہ پن جو قاری کو مسحور کر دیتا ہے۔ جاں نثار اختر کی شاعری میں روزمرہ بول چال کے محاورات بھی ہیں۔ لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ محض محاورات کی بنا پر کسی شاعری کو اعلیٰ و ارفع نہیں کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ شعر کی اصل روح موزونیت اور نغمائی آہنگ ہوتا ہے۔ گویا فن کا اعلیٰ معیار یہ ہے کہ وہ انبساط اور نشاط سے پیدا ہوتا ہے اور جس میں حسن کی موزونیت اور نغمائی آہنگی بھی پائی جاتی ہے۔ جس شاعر کا کلام پڑھ کر قارئین کے ذہن و دل میں ایک عجیب قسم کی لطافت و رعنائی اور رفعت پیدا ہوتی ہے وہ شاعر بڑا فن کار ہوتا ہے۔ جاں نثار اختر کی شاعری اس قول پر صادق آتی ہے۔ یہاں پر ایک امر اور واضح کر دوں کہ جاں نثار اختر ایک شاعر ہیں اور فکر و فن دونوں لحاظ سے ان کا کلام ایک شاعر کا کلام ہے۔ چنانچہ اس میں سحر کا ہونا کوئی غیر فطری بات نہیں۔ بلاشبہ اس میں کچھ نشیب و فراز بھی پائے جاتے ہیں۔ ان کے بعض اشعار ایسے ہیں جن میں فکر و فن کی رنگینیاں و دل فریبیاں تو موجود ہیں لیکن وہ ظاہری شکل و صورت کے اعتبار سے محض فکر منظوم ہو کر رہ گئے۔ گرچہ ان میں بھی شعر کا بنیادی وصف اور صوتی آہنگ ملتا ہے۔ بہر حال اس قسم کے اشعار کو فنی کمال کا درجہ عطا نہیں کیا جا سکتا۔ در حقیقت ایسے اشعار میں تخیل، تخلیقی عمل پورا کیے بغیر ہی صفحۂ قرطاس پر بکھر گئے ہیں اس لئے کہ شاعر کا اپنا مزاج و آہنگ تو آ گیا ہے مگر فنی باریکیوں اور پیچیدگیوں سے شاعر عہدہ برآ نہیں ہو سکا۔ اس ضمن میں جاں نثار اختر کے بالکل ابتدائی دور کے مجموعے "تارگریباں" اور "نذر بتاں" کی بعض چھوٹی چھوٹی نظمیں اور چند غزلیں مثال کے طور پر پیش کی جا سکتی ہیں۔

بعض دفعہ ہمارے کچھ ناقدین فصاحت کو بلاغت پر ترجیح دیتے ہیں اور بعض بلاغت ہی کو سب کچھ سمجھ لیتے ہیں اور فصاحت کے منکر ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ دونوں ہی صورتیں سراسر مغالطے پر بنی ہیں۔ یہ تو ویسی ہی مہمل اور فضول بات ہوئی کہ "ذوق ہمہ فصاحت تھے اور غالب محض بلاغت"۔۔۔ حالانکہ بہ نظر غائر دیکھنے کے بعد کہا جاسکتا ہے کہ فصاحت کا کوئی وجود بلاغت کے بغیر ممکن نہیں اور بلاغت کے بغیر فصاحت کا اصل مفہوم مفقود ہو جاتا ہے۔ جس فن میں شائستگی موجود ہو اور فن کا نکھار نہیں اور جس فکر میں بلند آہنگی ہو مگر فن شاداب نہیں۔ وہ فن ہرگز اعلی فن نہیں ہوگا۔ جاں نثار اختر کے فن کو پیش نظر رکھ کر متعدد ناقدین نے فصاحت اور بلاغت کو الگ الگ میزان پر تولنے کی کوشش کی ہے۔ فصاحت اور بلاغت کے درمیان فرق وہی لوگ کرتے ہیں جو "فن برائے فن" کے حامیوں میں سے ہیں۔اب یہ دیکھیں کے فصاحت و بلاغت کی تعریف کیا ہے؟ فصاحت سے مراد یہ ہے کہ بیان میں سلاست، روانی، چستی اور برجستگی موجود ہو۔ بلاغت کا مفہوم یہ ہے کہ خیال کو اس کی تمام جزئیات و تناسب کے ساتھ پورے طور پر ادا کیا جائے۔ چنانچہ ہم یہ کہنے میں یقیناً حق بجانب ہیں کہ فصاحت شعر کو محض اظہار کی حد تک لے جاکر چھوڑ دیتی ہے پھر بلاغت اسے خیال انگیزی اور پیکر تراشی کی سطح تک لے جاتی ہے۔ یعنی دونوں کی حیثیت لازم و ملزوم کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جاں نثار اختر اپنے اشعار کو شعریت کی اس آخری سطح تک لے جانے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

جاں نثار اختر کے فن پر جب بھی بحث ہوتی ہے۔ اس وقت یہ سوال اٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ وہ بنیادی طور پر غزل گو ہیں یا نظم نگار۔۔۔؟ حالانکہ یہ سوال ہی اٹھانا غلط ہے۔ اس لئے کہ عظیم فن کار جس صنف سخن پر طبع آزمائی کرتا ہے اس پر اپنی شخصیت کی گہری چھاپ چھوڑ جاتا ہے۔ انگریزی کے مشہور شاعر شیکسپیئر (Shakespear) کے سانیٹ (Sonnet) ٹریجڈی اور کامیڈی سب پر اس کی شخصیت کی مہریں ثبت ہیں۔ یہی حال جاں نثار اختر کا بھی ہے۔ ان کی شخصیت اور ان کی فن کارانہ صلاحیت ان دونوں صنفوں میں واضح

صورت میں ابھر کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ انھوں نے نظم میں شعریت کے بنیادی وصف تغزل کو سمونے کی کوشش کی۔ اور ساتھ ہی ساتھ غزل پر نظم کی ترتیب و تنظیم کی مہر ثبت کر دی۔ یہ کارگزاری یقینی طور پر بڑی مشکل تھی۔ مگر اسے بحسن وخوبی جاں نثار اختر نے انجام دیا انھوں نے ایک طرف غزل کی ریزہ کاری کو دور کر دیا اور دوسری جانب یہ اہم کام کیا کہ نظم کی درشتی کو ختم کیا۔ اس طرح غزل مربوط ہوتی چلی گئی اور نظم "سیال"۔ جس کا نتیجہ بر آمد یہ ہوا کہ غزل میں نظم کا ساگداز پیدا ہو گیا اور نظم میں غزل کے سوز نے جنم لیا۔ یہی وجہ تھی کہ جاں نثار اختر کی نظموں کا سیلاب رواں ہوا تو ان کی انقلابی اور منفرد شان ہونے کے باوجود کسی اہل فن نے بھی شر انگیزی سے کام نہیں لیا۔ گرچہ ان کی نظمیں اپنے تخئیل اور ارتقا کے اعتبار سے علاحدہ ڈھنگ کی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کی نظمیں نامانوس نہیں معلوم ہوئیں۔ غالباً اس کا عین سبب یہ ہے کہ انھوں نے اپنی نظموں کی تشکیل جدید کرتے وقت بڑی فنی چابک دستی سے کام لیا ہے اور قدیم روایات میں توسیع واضافہ بتدریج کیا ہے۔ اس طرح ہم جاں نثار اختر کے انقلابی کارنامے کی معنویت کو سمجھ لیتے ہیں اور اس کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ جاں نثار اختر ایک کامیاب فن کار تھے۔

جاں نثار اختر کے فن کے متعلق ان کے پورے شعری سرمایے و کارنامے کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے جو خیالات تحریر کیے ہیں ان کی مزید وضاحت کے لئے جاں نثار اختر کے بعض فنی نمونوں کا تنقیدی تجزیہ کرنا نہایت ہی مناسب ہے۔ یوں تو جاں نثار اختر کی بہتیری نظمیں اور غزلیں عمدہ و کامیاب ہیں لیکن میں ایسے شاہکاروں اور فن پاروں پر اپنی توجہ مرکوز کروں گا جن کی طرف ابھی تک کسی ناقد کی نگاہ نہیں اٹھی ہے۔ مثلاً "عزم" "آخری ملاقات"، "گرلس کالج کی لاری"، "خاموش آواز"، "خاک دل"، "بے زاری" اور "آخری لمحہ" وغیرہ مشہور و مقبول نظموں کا تجزیہ کرنے کے علاوہ ان کی چند غیر معروف مگر اہم نظموں پر بھی اظہار خیال کروں گا۔ مثلاً "مسافر"، "بنارس کا سفر"، "دیہات کی شام"، "گزرے ہوئے لمحات"، "میں ان کے گیت گاتا ہوں"، "بے دار ہے انسان"، "سویرا"،

''تجزیہ اور ''خدیجہ کے نام'' نظموں کے علاوہ ان غزلوں کا بھی جائزہ لوں گا، جن میں فن کاری اور حسن کاری سے کام لیا گیا ہے۔یا یوں کہیے کہ جو مظہر فن کی ایک وسیع کائنات ہیں۔

''عزم'' بظاہر ایک معمولی سی نظم معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔یہ نظم انھوں نے ''بے زاری'' کے بعد لکھی ہے۔یعنی جب جاں نثار اختر زمانے کے حوادثات و آلام سے بے زار ہو گئے تب انھوں نے ایک فیصلہ کیا اور یہی فیصلہ عزم کی صورت میں یوں نمودار ہوا۔

میں بہت دور بہت دور چلا جاؤں گا
جب مرے اشک ترے ہار کے قابل ہی نہیں
جب مرا پیار ترے پیار کے قابل ہی نہیں
میں بہت دور بہت دور چلا جاؤں گا

اور بلاشبہ اس عزم کے بعد وہ اپنی شریکۂ حیات اور لائق بیوی صفیہ اختر سے دور بہت دور چلے جاتے ہیں۔ بعد ازاں صفیہ ان سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو جاتی ہیں۔اس واقعہ کے بعد وہ بے حد متاثر ہوتے ہیں اور انھیں محسوس ہوتا ہے کہ ان کی دنیا اب بالکل تاریک ہو چکی ہے۔وہ کچھ دیر کی خاطر بے حد مایوس و مضمحل ہو جاتے ہیں لیکن اس کے بعد ان کا یہی عزم ان کو سہارا دیتا ہے اور یہاں پر وہ گرتے گرتے سنبھل جاتے ہیں۔پھر ان کا لب ولہجہ بلند ہو جاتا ہے اور ان کا فن اتنا نکھر جاتا ہے کہ وہ ''خاک دل'' جیسی شاہ کار نظم کی تخلیق کرتے ہیں۔اس نظم میں انھوں نے اپنی شریکۂ زندگی کی فرقت و فراق کا حال بیان کیا ہے۔وہ صفیہ کی موت، کے بعد خون کے آنسو روتے ہیں اور جذبات کی رو میں بہہ جاتے ہیں۔اس نظم کے ذریعے صفیہ کے انتقال کے بعد انھوں نے صفیہ مرحومہ کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔اس نظم کو ہم مرثیہ بھی کہہ سکتے ہیں۔اس نظم کا اختتام فکر انگیز اور کرب ناک ہے۔ جب قاری اس نظم کے آخری بند پر پہنچتا ہے تو وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

چوم کر آج تیری خاک لحد کے ذرے
ان گنت پھول محبت کے چڑھاتا جاؤں

جانے اس سمت کبھی میرا گزر ہو کہ نہ ہو
آخری بار گلے تجھ کو لگاتا جاؤں

لکھنو میرے وطن، میرے چمن زارِ وطن

دیکھ اس خاک کو آنکھوں میں بسا کر رکھنا
اس امانت کو کلیجے سے لگا کر رکھنا

لکھنو میرے وطن، میرے چمن زارِ وطن

"گرلس کالج کی لاری" ان کی بالکل ابتدائی دور کی نظموں میں سے ہے۔ یہ نظم اسی وقت مقبول عام ہو کر خراج تحسین وصول کرچکی تھی جس وقت جاں نثار اختر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طالب علم تھے۔ گویا یہ نظم ان کی طالب علمی کی زندگی کی حسین یادگار ہے جس عہد کی یادگار یہ نظم ہے۔ اس وقت جاں نثار اختر کا عشق بھی جوان تھا اور جوش وولولہ بھی۔۔۔ اس کا موضوع خالص رومانی، خیال سطحی اور اس پر جذباتیت کا گہرا رنگ غالب ہے۔ لیکن حقیقی منظر کشی کے اعتبار سے یہ نظم بے حد رنگین دلکش اور حسین ہے۔ اس نظم کے مطالعہ سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ طالب علمی کے عہد کا یہ شاعر آیندہ ایک اچھا اور کامیاب شاعر ہوگا۔ ذیل میں منظر نگاری کے چند اعلی ونفیس نمونے ملاحظہ ہوں۔

وہ سڑکوں پہ پھولوں کی دھاری سی بنتی
ادھر سے ادھر سے حسینوں کی چنتی
وہ ماتھے پہ ساڑی کے رنگیں کنارے
سحر سے نکلتی شفق کے اشارے
وہ لحجوں میں چاندی کھنکتی ہوئی سی
وہ نظروں میں کلیاں چٹکتی ہوئی سی
یہ کھڑکی سے اک ہاتھ باہر نکالے
وہ زانو پہ گرتی کتابیں سنبھالے

"آخری ملاقات" گرچہ ایک طویل رومانی نظم ہے لیکن اس میں جذبہ کی گرمی و

گہرائی۔احساس کی نرم لو اور دل کے دھڑکنے کی وہ آواز پائی جاتی ہے جو ہر شخص کی روح کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے اور دل کے تاروں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔اس نظم کی ایک منفرد خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں "ہندوستانی پن" ملتا ہے۔اس میں صرف ہندی الفاظ اور محاورے و تشبیہیں ہی نہیں استعمال کی گئی ہیں بلکہ اچھی ہندی شاعری کا حسن اور بھولا پن بھی موجود ہے۔اس نظم کی تیکنیک، اسلوب وسیلۂ خیال اور پیش کش کا انداز سب کچھ جاں نثار اختر کا اپنا ہے۔اس میں کسی دوسرے شاعر کا عکس نظر نہیں آتا۔یہ نظم فکری و فنی دونوں لحاظ سے ایک کامیاب نظم ہے۔ایک معتبر نقاد "آخری ملاقات" پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"نظم "آخری ملاقات" گویا شاعر کی داستان شعری کا کلائمکس ہے۔یہ نظم بتدریج ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی اختتام پر پہنچتی ہے۔یہ ابتدا سے انتہا تک ان حسین یادوں کی ایک خوب صورت مالا ہے جس کے ہر موتی میں شاعر کے خلوص اور فکر و نظر کی آب و تاب نظر آتی ہے۔" [1]

"خاموش آواز" شاعر نے اپنی شریک زندگی کی موت کے بعد اس کی قبر پہ جا کر لکھی ہے۔دنیائے اردو شاعری میں شخصی مراثی لکھنے کا رواج پہلے بھی تھا اور بیویوں کی موت پر نظمیں یوں تو بہت سے اردو شعرا نے لکھی ہیں لیکن اس نظم کی کیفیت ان نظموں کے مقابلے میں بالکل علیحدہ اور ممتاز ہے۔اقبال کی وہ نظم جو انھوں نے اپنی والدہ کے انتقال کے بعد "والدہ مرحومہ کی یاد" کے عنوان سے سپرد قلم کی ہے اس کے علاوہ اور کوئی دوسری نظم موجود نہیں جو مذکورہ نظم کے مقابل آسکے۔اس میں مکالماتی انداز اختیار کیا گیا ہے۔اور ساری باتیں صفیہ کی زبان سے کہلوائی گئی ہیں۔اس نظم کے مطالعہ سے عورت کی وفا شعاری، اس کی نسائی فطرت، اور شوہر پرستی غرضیکہ تمام خوبیاں ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔اس نظم میں مشرقی عورتوں کے کردار کی خوبیاں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہیں۔فنی اعتبار

ا۔ فن اور شخصیت جاں نثار اختر نمبر ص ۸۹

سے بھی محاکات کی اتنی دل آویز و عمدہ تصویر کشی قابل دید ہے۔ نظم فن کی وسعتوں سے گزر کر آخری منزل تک جا پہنچی ہے۔اس نظم کے چند بند ملاحظہ ہوں۔

(۱)

تم بن سارے موسم بیتے
آئے جھونکے سرد ہوا کے
نرم گلابی جاڑے گزرے
میرے دل میں آگ لگا کے

(۲)

چاند سے جب بھی بادل گزرا
دل سے گزرا عکس تمہارا
پھول جو چٹکے میں نے جانا
تم نے شاید مجھ کو پکارا

(۳)

میرے غم کو میرے شاعر
اپنے جواں گیتوں میں رچا لو
میرے غم کو میرے شاعر
سارے جگ کی آنکھ بنا لو

(۴)

دیکھو کتنے کام پڑے ہیں
اچھا اب مت دیر کرو تم
کیسے جم کر رہ سے گئے ہو
اتنا مت اندھیر کرو تم

"بے زاری" ان کی بعض مقبول ترین رومانی نظموں کی تخلیق کے بعد کی نظم ہے۔ مثلاً "گرلس کالج کی لاری"، "بنارس کا سفر" اور "آج کی رات" وغیرہم عنوان ہی سے ظاہر ہے کہ شاعر اپنے عہد، ماحول اور حالات سے نالاں ہے۔ اب شاعر حسن و عشق کی حسین وادیوں میں کھویا ہوا رہنا پسند نہیں کرتا بلکہ وہ حسن و عشق کی رنگین کائنات سے الگ ہو کر جینا چاہتا ہے۔ وہ اپنے آپ سے سخت بے زار ہو گیا ہے۔ اسی لئے وہ تمام یادوں کو بھلا کر اپنی دنیا میں گم ہو جانا چاہتا ہے۔ غالب نے بھی اپنے عہد و ماحول سے بے زاری کا اعلان اس طرح کیا تھا۔

رہئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زبان کوئی نہ ہو

بے درو دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

تقریباً ہر بڑے فن کار کے اندر یہ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ وہ اپنے زمانے، اپنے وقت و حالات سے مایوس و بے زار نظر آتا ہے اور اس بات کا اظہار جب کوئی فنکار پوری شدت کے ساتھ کرتا ہے تو اس کا فن اعلیٰ اور کامیاب ہوتا ہے۔ یہاں پر یہ امر وضاحت طلب ہے کہ ایسا فن کار جو محض بے زاری کا اظہار تو کرتا ہے لیکن راہ فرار اختیار نہیں کرتا۔ وہ بے شک ایک کامیاب اور بڑا فنکار ہوتا ہے۔ ایسے فن کار کو ہم قنوطیت پسند اور رجعت پسند ہرگز نہیں کہہ سکتے۔ البتہ جو فن کار راہ فرار اختیار کر لیتا ہے اسے ہم رجعت پسند کہہ سکتے ہیں۔ جاں نثار اختر کے یہاں ماحول سے بیزاری کے باوجود فرار کا عنصر نہیں پایا جاتا۔ یہی ان کی دلیل کامیابی ہے۔ نظم کے تین بند ملاحظہ فرمایئے۔

عشق کیا ہے ایک ذہنی اضطراب
حسن کیا ہے جاگتی آنکھوں کا خواب
علم کیا ہے اک سوال بے جواب

دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

ہر طرف بغض و عداوت، قتل و جنگ
کھا چکی انصاف کی میزان زنگ
لٹ چکا انسانیت کا نام و ننگ

دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

سلطنت اک ظلم،مذہب اک بلا
مفلسی اک جرم، محنت اک سزا
آپ کیا قہار سے کم ہے خدا

دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

گویا جاں نثار اختر قنوطی نہیں، بلکہ رجائی شاعر ہیں۔

"آخری لمحہ" ایک شاہکار نظم ہے جسے انھوں نے اپنی دختر نیک اختر عنیزہ سے مخاطب ہو کر لکھی ہے۔ اس کی امتیازی صفت یہ ہے کہ اس میں شاعر نے ذاتی عنصر بہت کم داخل کیا ہے۔ یہ نظم جواہر لال نہرو کی وصیت کی طرح محض ایک خوبصورت وصیت ہی نہیں، بلکہ یہ نظم ہر اس بچے کے نام معنون ہے جو ذات پات اور طبقات کے مارے ہوئے معاشرے میں پیدا ہوئے اور پل رہے ہیں اس نظم میں شاعر نے اپنی زندگی کے تجربات و مشاہدات کو حسین پیکر کا روپ عطا کیا ہے۔ اس نظم کے متعلق مدہوش بلگرامی نے صحیح رائے دی ہے کہ:

"یہ ایک ایسی نظم ہے جو نہ صرف درس گاہوں میں پڑھائی جائے بلکہ ہمارے مصیبت زدہ ملکوں کے خطوں میں گائی جائے۔ یہ ایک اہم اور روشنی دینے والا پیغام ہے جو غیر معمولی فن کاری کے ساتھ دیا گیا ہے۔ یہ نظم زندگی کے ضروری شعبوں کا احاطہ کرتی ہے۔"[1]

اس نظم کا ایک بند اتنا حسین، عمدہ اور دلکش ہے کہ جسے علی سردار جعفری کے الفاظ میں "شاعری کا پرچم" قرار دیا جائے تو کوئی غلط نہ ہوگا۔

"مسافر" آٹھ بندوں پر مشتمل ایک مختصر نظم ہے۔ لیکن یہ فنی اعتبار سے بڑے

بلند پایہ کی نظم ہے۔ ہم اور آپ سبھی جانتے ہیں کہ حیات انسانی کا کارواں جب منزل کی سمت بڑھتا ہے تو اس کی راہوں میں ان گنت دشواریاں پیش آتی ہیں۔ گویا تمام شعبہ ہائے زندگی میں مختلف قسم کی روکاوٹیں برابر حائل ہوتی رہتی ہیں۔ جاں نثار اختر نے ایسے انسان کا ذکر کیا ہے جو تمام دشوار گزار مراحل اور مصائب سے نبرد آزما ہوتا ہے اور آخر کار منزل مقصود تک پہنچ کر ہی دم لیتا ہے۔ جاں نثار اختر نے مسافر کو جہد مسلسل کرنے والے انسان کا پیکر بنا کر پیش کیا ہے۔ یعنی مسافر علامت ہے کاوش پیہم اور جدوجہد کی۔ دیکھئے مسافر کو کتنی عمدہ تلقین کی گئی ہے۔

اشارے سے تجھ کو بلالے نہ ساقی
تجھے میکدے میں بٹھا لے نہ ساقی
تیرے دل میں یہ بات ڈالے نہ ساقی
کہ یہ زندگی کیا ہے پینا پلانا
مسافر کہیں راہ مت بھول جانا

بہت راہ میں خانقاہیں ملیں گی
مشائخ کی تفریح گاہیں ملیں گی
مذاہب کی پر پیچ راہیں ملیں گی
نہیں جن میں منزل کا کوئی ٹھکانہ
مسافر کہیں راہ مت بھول جانا

ایک دوسرے بند میں شاعر نے مسافر کو اس بات سے خبر دار کیا ہے کہ غدار اور رہزن نما رہبر کی باتوں میں ہرگز نہ آنا کیونکہ یہی لوگ وہ دشمن ہیں جو تمہیں منزل تک پہنچنے نہیں دیں گے۔

ملاحظہ ہو یہ بند۔

ا۔ فن اور شخصیت ص ۸۲

سر راہ غدار اکثر ملیں گے
تہہ آستیں جن کے خنجر ملیں گے
بہت تجھ کو ایسے بھی رہبر ملیں گے
جنھیں یاد ہے صرف رستہ بھلانا

مسافر کہیں راہ مت بھول جانا

"بنارس کا سفر" ایک چھوٹی سی مثنوی ہے۔ جس میں لکھنو سے بنارس آنے کا تذکرہ ہے۔ گویا یہ ایک سفر نامہ ہے۔ یہ اس دور کی نمائندہ نظم ہے جن شاعر کی زندگی میں رنگ رلیاں تھیں۔ شاعر کوچہ جاناں کے طواف میں منہمک رہتا تھا۔ اس میں شہر بنارس کا پورا خاکہ اور اس کی تصویر کشی بڑی خوش اسلوبی سے کی گئی ہے۔ اردو اور فلمی دنیا کے مشہور و معروف شاعر شکیل بدایونی نے لکھنو شہر کی تعریف میں ایک نغمہ لکھا تھا۔ جس کا پہلا شعر یہ تھا۔

اے شہر لکھنو تجھے میرا سلام ہے
تیرا ہی نام دوسرا جنت کا نام ہے

اور ساحر لدھیانوی نے بھی کشمیر کی مدح میں ایک نغمہ لکھا تھا جس کے بول کچھ اس طرح تھے۔

ہر چہرہ یہاں چاند ہے تو ذرہ ستارہ
یہ وادیٔ کشمیر ہے جنت کا نظارا

مندرجہ بالا دونوں نغموں سے اس نظم کا موازنہ کرنے کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان دونوں نغموں پر اسے فوقیت حاصل ہے۔ اس نظم میں بلا کی روانی پائی جاتی ہے کیونکہ اس میں جو بحر استعمال کی گئی ہے وہ بے حد چست اور رواں دواں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نظم میں فن موسیقی کا شعوری طور پر التزام رکھا گیا ہے۔

کوئی سورج کو پانی دے رہی ہے
کوئی سینے پہ آنچل لے رہی ہے

اور اب منظر نگاری کے چند بے نظیر و عمدہ نمونے پیش ہیں۔

ہوا لہرا رہی ہے نرم آنچل
افق پر ناچتا ہے سبز جنگل
کہیں گورے خنک ماتھے پہ چندن
کنول ہوں جس طرح پانی پہ روشن
سحر اوڑھے شفق کی شال نکلی
لیے سر پر سنہرا تھال نکلی

اردو زبان و ادب کے علاوہ تمام دوسرے ادبیات عالم کے شعرا اور فنکاروں کا عموماً رویہ یہ رہا ہے کہ انھوں نے شہری زندگی کی گہما گہمی اور رنگینیوں کا ہی تذکرہ کیا ہے۔ بہت کم فنکاروں نے دیہی زندگی اور دیہی مسائل کو اپنے فن کا موضوع بنایا ہے۔ اردو میں نظیر اکبر آبادی واحد شاعر ہیں جنھوں نے عوامی شاعری کی ہے۔ انھوں نے گاؤں کے حالات و واقعات اور دیہات کے حادثات و تیوہاروں کو بھی اپنی شاعری کا مرکز و محور بنایا ہے۔ جاں نثار اختر نے یوں تو اپنی حیات کے بیشتر دن بڑے بڑے شہروں میں گزارے۔ لیکن اس کے باوجود انھیں پریم چند کی طرح دیہی چیزوں سے کافی دلچسپی رہی ہے اور یہی نہیں بلکہ ان کی قوت مشاہدہ بھی حیرت ناک ہے مثال کے لئے ان کی نظم "دیہات کی شام" کے چند اشعار پڑھیے اور قوت مشاہدہ کا لطف اٹھائیے۔

دور تک میدانوں میں کھیتوں کے پرے
جال سا بنتی ہوئی پگڈنڈیاں
فاختہ کی کوک، سارس کی صدا
مختلف چڑیوں کی اپنی بولیاں
اپنے اپنے موڑ پر لو مڑ گئیں
چلتی پھرتی گاؤں کی رنگینیاں
یہ سروں پہ گاگریں جیسے کلس
یہ گلوں میں چاند جیسی ہنسلیاں

"اودھ کی شام" انتہائی دلکش و دل فریب ہوتی ہے، یہ بات ہم سب لوگ اچھی

طرح جانتے ہیں۔ لیکن شاعر کی نگاہ میں شام اودھ کی کوئی خاص وقت نہیں، کیونکہ اس سے ہزار درجہ بہتر، پرلطف اور حسین شام دیہات کی شام ہوتی ہے اور یہ شام شاعر نے اپنی نظروں سے دیکھی ہے گویا اس شام کا تجربہ و مشاہدہ اس کا ذاتی تجربہ ہے۔

ڈوبتے سورج کا زریں یہ تھال
یہ افق پر جگمگاتی سرخیاں
دفعتاً ساری فضا سنولا گئی
جھونپڑوں میں ٹمٹمائیں بتیاں

"گزرے ہوئے لمحات" بیالیس بندوں پر مبنی ان کی ایک طویل نظم ہے یاد ماضی کے نقوش اتنے گہرے اور دیرپا ہوتے ہیں کہ وہ بھلائے نہیں جاسکتے اور ان سے دنیا کا کوئی بھی شخص متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ظاہر ہے جب ایک عام انسان اس سے مبرا نہیں تو پھر ایک شاعر کیسے علیحدہ رہ سکتا ہے؟ جو بے حد حساس دل و دماغ کا مالک ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جاں نثار اختر نے بھی بیتے دنوں کو یاد کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکالی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ گزشتہ لمحات کو یادوں کی پرچھائیاں سمجھ کر خوب جی بھر کر رو لینے سے دل کا بوجھ قدرے ہلکا ہو جاتا ہے۔ شاعر نے اپنے محبوب کے ساتھ جو چند لمحے گزارے تھے۔ گرچہ وہ بہت مختصر سہی۔ لیکن شاعر کے لیے وہی چند حسین لمحے سرمایۂ حیات کی حیثیت رکھتے ہیں جن کے سہارے شاعر اپنی زندگی کی تکمیل کرنا چاہتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

عارض پہ مچلتی ہوئی ہر بار شفق سی
آنکھوں کے کٹوروں سے ابلتی مئے جذبات
سینے کا وہ کمبخت دل آویز تموج
سانچے میں ڈھلے جاتے تھے اڈے ہوئے جذبات
لہجے میں تیرے آہ وہ اشکوں کا ترنم
آنکھوں میں تری ہائے وہ چھائی ہوئی برسات

کیوں یاد ہیں وہ وقت جدائی مرے الفاظ
شاید کہ نہ ہو اب کبھی ناہید ملاقات

شاعر کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ سماج، دولت، قانون، اور مجبوریاں راہ میں حائل ہوگئیں۔ درج ذیل اشعار سے ان باتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

دولت کے یہاں بندۂ بے دام و درم ہیں
قانون ہو یا شرع ہو یا رسم و روایات
پھر تو بھی تو مجبور تھی، مجبور بھی کیسی
ٹوٹی ترے بازو سے نہ زنجیر روایات
تھا ہم کو یقیں جن کی حیات ابدی کا
وہ پیار کی گھڑیاں تھیں فقط خواب کے لمحات

"میں ان کے گیت گاتا ہوں" گرچہ مختصر سی نظم ہے، لیکن اس کا موضوع بڑی وسعتوں کا حامل ہے۔ اس میں جمہوریت کی تعریف اور آزادی حاصل کرنے والوں کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ اس میں مزدور طبقے کی قوتوں کو بھی تسلیم کیا گیا ہے اس میں ان لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جو ذات پات یا قوموں کے درمیان تفریق پیدا کرتے ہیں۔ اور جو لوگ فرقہ وارانہ فساد کو شہہ دیتے ہیں یا جو لوگ عصبیت کے شکار ہو جاتے ہیں۔ اس میں جو پیغام ہے وہ عالم انسانیت کے لئے گراں مایہ تحفہ ہے۔ ذیل میں ظالم و جابر حکومت کا تختہ الٹ دینے کی تاکید کی گئی ہے۔

جو شانے پر بغاوت کا علم لے کر نکلتے ہیں
کسی ظالم حکومت کے دھڑکتے دل پہ چلتے ہیں
میں ان کے گیت گاتا ہوں

اب دیکھیے فرقہ پرستی اور عصبیت کا خاتمہ کرنے والوں کے لئے وہ کہتے ہیں۔

جھلس سکتے ہیں جو شعلوں سے کفر و دیں کی بستی کو
جو لعنت جانتے ہیں ملک میں فرقہ پرستی کو
میں ان کے گیت گاتا ہوں

ان نوجوانوں کی تعریف سنیئے جو حق وانصاف اور آزادی حاصل کرنے کی خاطر جنگیں کرتے ہیں۔

جو آزادی کی دیوی کو لہو کی بھینٹ دیتے ہیں
صداقت کے لئے جو ہاتھ میں تلوار لیتے ہیں

میں ان کے گیت گاتا ہوں

محنت و مزدوری کرنے والے غریب کسان کے متعلق وہ کیا رائے قائم کرتے ہیں۔ دیکھیئے۔ اس بند میں جاں نثار اختر کی اشتراکیت کا واضح نظریہ ابھر کر ہمارے سامنے آگیا ہے۔

وہ محنت کش جو اپنے بازوؤں پر ناز کرتے ہیں
وہ جن کی قوتوں سے دیو استبداد ڈرتے ہیں

میں ان کے گیت گاتا ہوں

"بے دار ہے انسان" میں آج کے انسان اور کل کے انسان کے مابین فرق کو واضح کیا گیا ہے۔ کل کے انسان نے اتنی ترقی نہیں کی تھی۔ آج کا انسان ایسا ایسا کارنامہ ہائے نمایاں انجام دے رہا ہے جو حیرت انگیز و طلسم ہوش ربا ثابت ہو رہا ہے۔ موجودہ عہد کی سائنسی ایجادات و اختراع کا سہارا اسی کے سر ہے جسے جنت سے نکالا گیا تھا اس نے آج فلک، ارض سماں اور اس کائنات کی ساری چیزوں کو مسخر کرلیا ہے۔ آج کا انسان واقعی "اشرف المخلوقات" کہلانے کا مستحق ہے۔

قدموں میں سمندر ہے تو مٹھی میں ہوائیں
محکوم ہیں بجلی سے بھی معمور فضائیں
تدبیر کا بل دیکھ کے تقدیر ہے حیران

بیدار ہے انسان

ایک دوسرے بند میں شاعر نے ان خیالات کو پیش کیا ہے کہ پچھلے دنوں

انسانوں میں اوہام پرستی اور ذات پات کا بھید بھاؤ بہت زیادہ پایا جاتا تھا۔ لیکن عصر حاضر کا انسان اب ان چیزوں سے مستثنیٰ ہو گیا ہے۔

سہمے ہوئے اوہام کے جی چھوٹ رہے ہیں
ذاتوں کے تراشے ہوئے بت ٹوٹ رہے ہیں
اصنام کدہ نسل کا ہونے لگا ویران

بیدار ہے انسان

زمانہ قدیم سے یہ رواج چلا آرہا ہے کہ غلط قسم کے عقیدے کی دہائی دی جاتی ہے اور اس کے ذمہ دار پنڈت، ملاؤں، مولویوں، برہمنوں کو کہا جاتا ہے۔ دیکھئے یہ بند۔

سینوں میں لرزنے لگی ایمان کی بنیاد
آنے لگا فرسودہ عقائد کو خدا یاد
اب مذہب و ملا کا ہے اللہ نگہبان

بیدار ہے انسان

عہد قدیم میں ہر جگہ شہنشائیت کا دور دورہ تھا۔ لیکن عہد حاضر میں بیشتر ملکوں میں جمہوری نظام اور عوامی حکومت قائم ہے۔ اور یہ سب کیسے ہوا؟ ظاہر ہے یہ عوامی بغاوت کا نتیجہ ہے۔

تھرا کے گرے جاتے ہیں شاہوں کے علم آج
اکھڑے نظر آتے ہیں حکومت کے قدم آج
نعروں سے بغاوت کے گونجا ہوا میدان

بیدار ہے انسان

اس نظم میں جو تراکیب والفاظ استعمال کیے گئے ہیں اور جو اسلوب بیان اختیار کیا گیا ان کے پیش نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ سب جوش ملیح آبادی کی انقلابی شاعری کا فیض ہے۔

"سویرا" نو بندوں پر مشتمل مختصر سی نظم ہے سویرا روشنی اور صبح کی علامت کے

طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس نظم کا مرکز و محور، ماضی اور حال ہے۔ گویا اس میں ماضی اور حال کے تانے بانے بنے گئے ہیں۔ اس نظم کے مطالعہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ جاں نثار اختر کا تجربہ بے حد وسیع تھا۔ اس نظم کی ابتدا موثر و دل کش انداز میں ہوتی ہے۔

تاریک افق کے ماتھے سے صدیوں کی سیاہی چھوٹ گئی
ظلمات کا سینہ چاک ہوا، لو سانس بھی شب کی چھوٹ گئی
لو صبح کی پو بھی پھوٹ گئی

اب ایک اور بند دیکھئے۔ جس میں حال کی تصویر فن کارانہ چابک دستی سے کھینچی گئی ہے۔

افلاس کی بے رنگ آنکھوں میں امید کی لالی چھانے لگی
مزدور کے سادہ ماتھے پر گل رنگ شفق لہرانے لگی
رنگین کرن بل کھانے لگی

اب آیئے ہم جاں نثار اختر کی غزلوں کا فنی تجزیہ پیش کریں۔ غزل کو کسی نے اردو شاعری کی آبرو تسلیم کیا اور کسی نے غزل کو 'نیم وحشی صنف شاعری" قرار دیا۔ ایک اور معتبر ناقد نے فرمایا ہے کہ غزل چاول پر قل ہو اللہ لکھنے کا فن ہے۔ گویا ابھی تک غزل کے متعلق جتنے ناقدوں نے اپنی اپنی آرا کا اظہار کیا ہے۔ اس میں سے بعض نے غزل کی تاریخ سے منہ موڑ لیا اور کسی نے حد درجہ مبالغہ آرائی سے کام لیا بہر کیف ان باتوں کی صداقت پر ہم ایمان لائیں یا نہ لائیں۔ مگر اتنا تو، ضرور تسلیم کریں گے کہ غزل ہماری میراث ہے اور غزل کا سرمایہ قابل قدر و قابل فخر ہے۔ چنانچہ جاں نثار اختر بھی غزل کی عظمت کا اعتراف یوں کرتے ہیں۔

ہم سے پوچھو کہ غزل کیا ہے، غزل کا فن کیا
چند لفظوں میں کوئی آگ چھپادی جائے

بلاشبہ چند لفظوں میں آگ چھپانے کا فن سخت محنت و ریاضت کے بعد ہی ہاتھ

آسکتا ہے۔ جاں نثار اختر نے بھی اس فن پر قدرت کاملہ حاصل کرنے کے لئے ایک لمبے عرصے تک تپسیا کی ہے یہی سبب ہے کہ ان کی وہ غزلیں جو انھوں نے موت سے چند برس پیشتر لکھی ہیں۔ فنی ارتقا کی اہم کڑیاں ہیں۔ یہاں ایک غزل درج کر رہا ہوں گرچہ اس غزل کا موضوع حسن و عشق ہے۔ یعنی اس غزل کی پوری فضا حسن و عشق کی داستان سے لبریز ہے۔ لیکن اس کے باوجود فنی اعتبار سے ایک کامیاب غزل ہے ع

ہم سے بھاگا نہ کرو دور غزالوں کی طرح
ہم نے چاہا ہے تمہیں چاہنے والوں کی طرح

اور کیا اس سے زیادہ کوئی نرمی برتوں
دل کے زخموں کو چھوا ہے ترے گالوں کی طرح

تری زلفیں، تری آنکھیں، ترے ابرو ترے لب
اب بھی مشہور ہیں دنیا میں مثالوں کی طرح

ہم سے مایوس نہ ہو اے شب دوراں کہ ابھی
دل میں کچھ درد چمکتے ہیں اجالوں کی طرح

مجھ سے نظریں تو ملاؤ کہ ہزاروں چہرے
میری آنکھوں میں سلگتے ہیں شوالوں کی طرح

اور تو مجھ کو ملا کیا مری محنت کا صلہ
چند سکے ہیں مرے ہاتھ میں چھالوں کی طرح

اب ایک ایسی غزل درج کر رہا ہوں جو بہت چھوٹی بحر میں لکھی گئی ہے۔ فن شاعری سے جو لوگ تھوڑی بہت بھی واقفیت رکھتے ہوں گے انھیں اس بات کا اندازہ ہوگا کہ بڑی بحر میں غزل کہنا کوئی دشوار نہیں۔ لیکن اس کے برعکس چھوٹی چھوٹی بحروں میں

غزل لکھنا دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مصداق ہے۔ چنانچہ اس قبیل کی غزلیں وہی شعرا کہہ سکتے ہیں جن کے اندر غیر معمولی فن کارانہ صلاحیتیں موجود ہوں۔ اس طرح ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ جاں نثار اختر ایک منفرد و کامیاب فن کار تھے۔ یہ غزل اتنی رواں دواں ہے کہ جتنی کسی ندی میں روانی ہوتی ہے۔ اس میں الفاظ بہت ہی سیدھے سادے اور عام فہم استعمال کیے گئے ہیں۔ تاہم یہ غزل فن کاری کے لحاظ سے ایک بیش بہا سرمایہ اور حسین اضافہ ہے۔ غزل کا مطالعہ اگر آپ بہ نظر غائر کریں گے تو میری باتوں کا قائل ہونا ہی پڑے گا۔ ع

انقلابوں کی گھڑی ہے
ہر "نہیں" "ہاں" سے بڑی ہے

کیا ہوئے رات کے راہی
راہ سنسان پڑی ہے

اب کہاں آنکھ میں آنسو
دھول پلکوں سے جھڑی ہے

کتنی لاشوں پہ ابھی تک
اک چادر سی پڑی ہے

روح کی پیاس کے آگے
جسم کی پیاس بڑی ہے

رات رستے سے ہٹے بھی
صبح آنے کو کھڑی ہے

کبھی ایسا بھی لگا ہے
زندگی بند کھڑی ہے

زندگی ہاتھ پسارے
آج رستہ پہ کھڑی ہے

تپ اٹھا جسم زمیں کا
کیا قیامت کی گھڑی ہے

اب ایک ایسی غزل دیکھئے جس کا لب ولہجہ خطابیہ ہے۔

اس غزل کی ردیف اور قافیہ کو ہم نیا ہرگز نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس پر بے شمار شعرا نے طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن جاں نثار اختر کا کمال فن یہ ہے کہ اس پرانی ردیف و قافیہ کو نئے بانکپن اور نرالے انداز سے پیش کیا ہے۔ ان کی یہ غزل فکری وفنی نزاکتوں کی ایک عمدہ مثال ہے۔ اس میں ایک اعلیٰ درس بھی دیا گیا ہے۔ ع

فرصت کار فقط چار گھڑی ہے یارو
یہ نہ سوچو کہ ابھی عمر بڑی ہے یارو

اپنے تاریک مکانوں سے تو باہر جھانکو
زندگی شمع لئے در پہ کھڑی ہے یارو

فاصلہ چند قدم کا ہے منالیں چل کر
صبح آئی ہے مگر دور کھڑی ہے یارو

جب بھی چاہیں گے زمانے کو بدل ڈالیں گے
صرف کہنے کے لئے بات بڑی ہے یارو

کس کی دہلیز پہ لے جا کے سجائیں اس کو
بیچ رستے میں کوئی لاش پڑی ہے یارو

ہم نے صدیوں انھیں ذرّوں سے محبت کی ہے
چاند تاروں سے تو کل آنکھ لڑی ہے یارو

ان کے بن جی کے دکھا دیں گے انھیں، یونہی سہی
بات اتنی ہے کہ ضد آن پڑی ہے یارو

اب ایک ایسی غزل درج ہے جس میں ٹھیٹھ اردو کا سنگیت ملتا ہے اور تخیل کے نئے رنگ کا بھی احساس ہوتا ہے یعنی اس کا تخیل انوکھا اور منفرد ہے۔ علاوہ ازیں اس میں دوہوں کا رس بھی گھلا ہوا ہے۔ اس میں ہندی کے الفاظ اس قدر فنی مہارت اور خوبصورتی سے غزل کے پیرائے میں بیان کیے گئے ہیں کہ ایک عجیب لطف و چاشنی کا احساس ہوتا ہے۔ ع

ایک تو نیناں کجرارے اور تس پر ڈوبے کاجل میں
بجلی کی بڑھ جائے چمک کچھ اور بھی گہرے بادل میں

چاند کی پتلی نوک پہ جیسے کوئی بادل ٹک جائے
ایسے اس کا گرتا آنچل اٹکے آڑی ہیکل میں

پیاسے پیاسے نیناں اس کے جانے پگلی چاہے کیا
تٹ پر جب بھی جاوے، سوچے ندیا بھرلوں چھاگل میں

کھڑکی کی باریک جھری سے کون یہ مجھ تک آجائے
جسم چرائے، نین جھکائے، خوشبو باندھے آنچل میں

صبح نہانے جوڑا کھولے، ناگ بدن سے لپٹیں
اس کی رنگت اس کی خوشبو، کتنی ملتی صندل میں

پیار کی یوں ہر بوند جلا دی میں نے اپنے سینے میں
جیسے کوئی جلتی ماچس ڈال دے پی کر بوتل میں

آج ذرا للچائی نظر سے اس کو بس کیا دیکھ لیا
پگ پگ اس کے دل کی دھڑکن اتری آئے پایل میں

گوری اس سنسار میں مجھ کو ایسا تیرا روپ لگے
جیسے کوئی دیپ جلا ہو گھور اندھیرے جنگل میں

آخر میں ایک ایسی غزل پیش کرتا ہوں۔ جس کا لب ولہجہ ایک دم اچھوتا ہے۔ اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کے مطالعہ کے بعد احساس ہوتا ہے کہ یہ غزل نہیں نظم ہے۔ یعنی اس میں ایسے موضوعات در آتے ہیں جو عام طور پر نظموں کا حصہ ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس میں جو قوافی استعمال ہوئے ہیں وہ روایتی یا گھسے پٹے ہوئے قطعی نہیں ہیں۔ بلکہ ہر قافیہ ایک الگ شان امتیاز رکھتا ہے۔ گویا اس غزل کا ایک ایک قافیہ انفرادیت کا حامل ہے۔ اس میں جو ہندی الفاظ در آتے ہیں انھیں بڑی فنکارانہ چابک دستی سے جاں نثار اختر نے پیش کیا ہے۔ اور اس بات کا پورا خیال رکھا ہے کہ غزل کی اصل روح کو صدمہ نہ پہنچے۔ حالانکہ ہندی الفاظ کی کثرت سے اکثر یہ خوف لاحق رہتا ہے کہ غزل کی روح اور اس کی جان مجروح نہ ہو جائے۔ ع

آئے کیا کیا یاد نظر پڑتی جب ان دالانوں پر
اس کا کاغذ چپکا دینا گھر کے روشن دانوں پر

شہر کے تپتے فٹ پاتھوں پر گاؤں کے موسم ساتھ چلیں
بوڑھے برگد ہاتھ سا رکھ دیں میرے جلتے کاشانوں پر

سستے داموں لے تو آئے لیکن دل تھا بھر آیا
جانے کس کا نام لکھا تھا پیتل کے گلدانوں پر

شعر تو ان پر لکھے لیکن اوروں سے منسوب کیے
ان کو کیا کیا غصہ آیا نظموں کے عنوانوں پر

اور بھی سینہ کسنے لگتا، اور کمر بل کھاجاتی
جب بھی اس کے پاؤں پھسلنے لگتے تھے ڈھلوانوں پر

برکھا کی تو بات ہی چھوڑو چنچل ہے پروائی بھی
جانے کس کا سبز دوپٹہ پھینک گئی ہے دھانوں پر

اس کا کیا من بھید بتائیں اس کا کیا انداز کہیں
بات میری سننا چاہے، ہاتھ بھی رکھے کانوں پر

جاں نثار اختر ۱۸ر اگست ۱۹۷۶ء کو جسلوک ہسپتال ممبئی میں شام کے تین بجے اس دار فانی سے کوچ کر گئے لیکن میری نگاہ میں جاں نثار اختر ابھی بھی زندہ ہیں۔ کیونکہ جاں نثار اختر ایک فنکار تھے اور فنکار کا فن امر ہوتا ہے۔ اسے موت کبھی نہیں آتی۔ جاں نثار اختر نے اپنی فکر اور فن کے ذریعہ اردو شعر وادب کو بہت سے قیمتی اور نادر تحفے دیے ہیں اور انہوں نے جو عالم انسانیت کو ایک اعلیٰ پیغام دیا ہے اسے دنیا کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

بقول ساحر لدھیانوی ؎

ہونٹ تھم جانے سے پیغام نہیں رک جاتے
جسم کی موت کوئی موت نہیں ہوتی ہے

جاں نثار اختر

ناقدین اور معاصرین کی نظر میں

جاں نثار اختر کے فکر و فن کے متعلق ملک کے نام ور اہل قلم اور ناقدین نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ یہ ہے۔

اردو کے مشہور و معروف نقاد پروفیسر احتشام حسین نے جاں نثار اختر کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا ہے:

"جہاں تک جاں نثار اختر کی شاعری کو میں نے سمجھا ہے میں یہی نتیجہ نکالنے پر مجبور ہوں کہ مسائل حیات کے سمجھنے، سلجھانے، ان پر قابو پانے اور ان کے لطف حاصل کرنے کی جو کوشش وہ کرتے ہیں یا جو صورتیں انھیں پیش آتی ہیں وہ انھی کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں۔ انھوں نے اپنی کوئی ایسی دنیا نہیں بنائی ہے جس پر دوسروں کے دل مسرور اور رنجیدہ ہوں میں نے اختر کی رومانی اور غیر رومانی نظمیں کافی پڑھی ہیں۔ ان کی ابتدائی شاعری میں جو نظریاتی کچاپن تھا وہ ۱۹۳۸ء کے بعد سے دور ہونے لگا اور اب ان کی شاعری کا موضوع وہ انسان ہے جو سماج اور فطرت پر قابو پا کر ایک بہتر، متوازن اور بھرپور

لطافتیں رکھنے والی زندگی کے لئے جدو جہد کر رہا ہے۔ اس کی محبت، اس کے سیاسی خیالات، اس کے سماجی اور معاشی تصورات بس اسی طرف مڑتے ہیں۔ اختر نے جدو جہد کرنے والے کو مسافر کی علامت بنا کر پیش کیا ہے اور شاعرانہ انداز میں ان دشواریوں کا ذکر کیا ہے جو اس کی راہ میں حائل ہوں گے۔"

اردو کے مشہور و مقبول اور ممتاز شاعر حضرت جوش ملیح آبادی فرماتے ہیں:

"اختر کی شاعری میں ہمیں زندگی کی حقیقتیں، مناظر کی دل فریبیاں، نفسیات کی باریکیاں اور رومان کی برنائیاں ملتی ہیں اور یہ سب چیزیں ایسی سموئی ہوئی ہیں، جس طرح کوئی نباض موسیقی متعدد راگنیوں کو ملا کر ایک نغمہ شیریں پیدا کرتا ہے کہ اس سے بزم پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اس کے دوش بدوش اختر کی شاعری میں جو انقلابی عنصر ہے وہ اس قدر جاندار ہے اور جاندار کے ساتھ ساتھ دل کش اور ہموار ہے کہ دلوں پر براہ راست اثر پڑتا ہے۔"

ڈاکٹر ظ انصاری نے اختر کی شاعری پر لکھتے ہوئے فرمایا ہے:

"اگر سائنس میں کلاسیکی رومانٹک شاعری کہنا مناسب ہو تو ہماری زبان کے موجودہ دور میں وہ جاں نثار اختر کا کلام ہے کہ اسے کلاسیکی نوک پلک اور رچاؤ ورثے میں ملا ہے۔ رومانوی دور کی زبان، والہانہ انداز اور آزادانہ برتاؤ ان کے مزاج نے بخشا ہے اور مطالعے نے اردو کے پرانے دفینے کی کنجیاں حوالے کر دیں وہ یوں تو کسی رنگ میں بند نہیں۔ لیکن اصل رنگ غنائی ہے، ذاتی بھی سماجی بھی۔ لفظوں کا بہاؤ اور جدید ترنم جاں نثار اختر کے ہاں اس مقام پر پہنچ گیا ہے کہ الفاظ شاعر کے ارادے اور اس کے مشورے سے بے نیاز خود بخود ایک ترتیب اور سلیقے کے ساتھ جڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں جیسے ندی کے نرم بہاؤ پر دیئے کی قطاریں، یا پھولوں کی مالائیں۔"

جاں نثار اختر کی شاعری کا لباس ریشمی ہے، ریشمی نہیں کہیں کہیں گھوگھرو کی گوٹ لگی ہے۔ کانٹے سے جو چبھتے ہیں۔ لفظوں کی کثرت و تکرار، جھار اور پھندے بھی ٹانگ

رکھے ہیں۔ سوز و ساز اگرچہ پرانے لفظ ہیں تاہم اگر ان کا پورا مفہوم نظر میں رکھیں تو اختر کی شاعری میں سوز کم ہے ساز زیادہ۔ عاشق کم ہے، حسن پرستی زیادہ۔ تجربہ محدود ہے، پہلوداری زیادہ صاف نظر آتا ہے کہ اس رومانی شاعر نے رومانوی غنائیت کو ہر مرحلے میں ہر پہلو سے برتا ہے۔ اپنی شخصیت باطنی پیکر سے تباہ کیا ہے اس کی خلوت اپنی جلوت سے کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔ شاعر زخمی ہوتا ہے، تار گریباں چنتا ہے لیکن شاعرانہ صداقت کو زخمی ہونے سے بچالیتا ہے۔ اس نے اپنی شاعری کو صورت و معنی دونوں اعتبار سے مسلسل اور رنگین دائرے کی صورت دے کر اطمینان حاصل کر لیا کہ شاعر کی صحیح قدر و قیمت آج کا زمانہ بھی دے گا۔"

علی سردار جعفری نے "خاک دل" کی اشاعت ہونے کے وقت جاں نثار اختر کو ایک خط لکھا تھا اس خط میں یہ تحریر فرمایا تھا کہ:

"تمہاری شاعری تمہارے ہم عصر شعرا کی طرح چالیس سالوں کے طوفان سے گزری ہے۔ اگر تمہاری آواز کی کھنک آج بھی باقی ہے تو یہ اس کا ثبوت ہے کہ تمہاری شاعری سچی ہے۔ جیسے گنگا اپنی روانی میں ہر طرح کے ندی نالوں کا پانی سمیٹتی جاتی ہے۔ لیکن اپنی پاکیزگی کو برقرار رکھتی ہے اس طرح تمہاری شاعری نے بھی ہر قسم کی نظریاتی اور غیر نظریاتی آلائشوں اور لطافتوں دونوں کو اپنے دامن میں سمیٹا ہے اور اس کے بعد بھی پاکیزہ ہے یہ بہت بڑی بات ہے۔"

ڈاکٹر قمر رئیس نے جاں نثار اختر کی طویل نظموں کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے:

"ارض وطن کے ہر شیوہ و ادا سے شاعر (جاں نثار اختر) کو والہانہ پیار ہے۔ لیکن یہ وطن پرستی، اشتراکی انسانی دوستی کے اس بلند نصب العین سے کہیں متصادم نہیں ہوتی۔ جو ان کی نظموں میں روح کی طرح موجزن ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان نظموں کو طویل نظم اس مفہوم میں کہنا مشکل ہے۔ اس مفہوم میں اس کا اطلاق مغرب میں ہوتا ہے عصر حاضر کے معاشرہ میں انسانی وجود کے آشوب اور انسانی تہذیب کے بحران کی فلسفیانہ تعبیر اور

صورت گری۔۔۔ان نظموں میں حقیقت پسندی کا ایک خاص رویہ انسانی زندگی کے تاریک، ویران اور یاس انگیز پہلوؤں پر زور دیتا ہے۔ اس کے برعکس جاں نثار اختر کی نظموں میں تاریخی شعور انسان کے حال اور مستقبل کے بارے میں یقین اور اعتماد بخشتا ہے۔"

خواجہ احمد عباس نے جاں نثار اختر کی شاعری پر یوں اظہار خیال کیا ہے:

'پہلی بات جو جاں نثار کی شاعری میں ہے وہ یہ کہ جو بات بھی دل سے نکلتی ہے وہ سننے والے یا پڑھنے والے کے دل میں اتر جاتی ہے۔ خواہ وہ بات انقلابی ہو یا رومانی، اور بے لاگ ہوتی ہے۔ ایک اور منفرد خصوصیت جو اس کی شاعری میں ملتی ہے وہ ہے اس کا ہندوستانی پن" ان کے یہاں عرب وایران نہیں، ہندوستان ملتا ہے، ہندی کے نہ صرف الفاظ، محاورے، اور تشبیہیں بلکہ اچھی ہندی شاعری کی روانی اور بھول پن۔ جیسے ان کی نظم "آخری ملاقات" میں۔"

اردو کے ممتاز ناقد پروفیسر خواجہ احمد فاروقی رقم طراز ہیں:

"جاں نثار اختر نے غزل کے میدان میں اس وقت قدم رکھا ہے۔ جب اس کی گردن مارے جانے کا اعلان ہو چکا تھا اور وہ بوڑھا زندگی کے ابتذال انتشار اور پراگندہ مزاجی کی علامت سمجھی جانے لگی تھی۔ انھوں نے نئی غزل کے ذریعہ نہ صرف اس کا رشتہ ادبی تاریخ سے پھر جوڑا بلکہ یہ کہ اس کو ایک نئی کوشش، نئی شش جہت، نئی معنویت، نئی حسیت، نئی لفظیات اور نئی دل کشی عطا کی ہے اس اعتبار سے غزل کی عصری تاریخ میں ان کی حیثیت سنگ میل کی سی ہے۔ ان کی غزلیں صاف عصر حاضر کی چیز معلوم ہوتی ہیں۔"

اردو کے مشہور و معروف نقاد پروفیسر آل احمد سرور فرماتے ہیں۔

"جاں نثار اختر اس دور کے ان ممتاز شاعروں میں سے ہیں۔ جن پر ہماری شاعری اور ادب بلاشبہ فخر کر سکتا ہے۔ جاں نثار کے یہاں روایت کے صالح عناصر کی پاس داری اور عرفان کے ساتھ اس دور کے درد و داغ اور سوز و گداز کی جس طرح آئینہ داری کی گئی ہے۔ وہ بڑے بڑوں کی بس کی بات نہیں۔ جاں نثار نے نئے کو سمجھا ہے۔ اور برتا ہے۔۔۔ مگر ان کا

نیاپن نہ فیشن کے لئے ہے نہ فارمولے کی خاطر اور نہ یہ صرف مختلف ہونے پر نازاں ہے۔یہ مختلف بھی ہے اور منفرد بھی،اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی پناہ میں میر و غالب، حسرت و اقبال سبھی کو جذب کیے ہوئے ہے۔ہاں اس کے ساتھ اس میں روح کی ماجرا ہے۔حال کے ذہنی سفر کی داستان ہے۔زندگی کے موجودہ موڑ پر انسانیت کے کرب کی کہانی ہے۔۔دور حاضر کا علم ہے اس لمحے کا عرفان ہے اور زندگی کی لا معنویت کے ساتھ اس کی عظمت کی خبر ہے۔

ڈاکٹر محمد حسن کہتے ہیں:

"جاں نثار اختر کی شاعری میں نیا لب ولہجہ پچھلے چند سال کا سب سے اہم اور خوش گوار ادبی حادثہ ہے۔ جاں نثار اختر ان قدما میں سے ہیں جو قدیم ہونے سے انکار کرتے ہیں۔جن کی خاموشیاں بھی تھکن کے بجائے فکر کی بلاغت سے معمور ہیں۔۔۔جاں نثار نے پھر نغمہ سرائی شروع کر دی ہے اور تعجب یہ ہے کہ یہ نغمہ سرائی ماضی کا تسلسل یا پرانی دھنوں کی تکرار نہ تھی۔ایسے نرالے اور شگفتہ نغموں سے عبارت تھی کہ بس۔۔۔ جیسے اپنے نغموں کے مقدس آتش خانوں کی آگ روشن کر کے جل جانے والے مرغ آتش نوا نے دوسرا جنم لیا ہو۔ایسا نیا جنم کہ پرانے جاننے والوں کے لئے بھی یقین کرنا مشکل ٹھہرا کہ کلام کے یہ دونوں رنگ ایک ہی شاعر کی تراوش فکر ہیں۔"

عمیق حنفی نے جاں نثار اختر پر ایک مضمون لکھا ہے اس مضمون میں وہ کہتے ہیں۔

"جاں نثار اختر ہمارے عہد کے اردو شاعروں میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ان کی شاعری سچے احساس اور کھرے جذبے کی شاعری ہے کلاسیکی، رومانوی اور ترقی پسند اور جدید اجزا کے باوصف ایک انفرادی رنگ و آہنگ رکھتی ہے۔جو بڑا مزا دیتا ہے۔یہ شاعری اور عمل کی سرحد پر مشاہدے کی سطح پر جنم لیتی ہے۔اس کا بیشتر حصہ "خالص شاعری" (Pure Poetry) کے زمرے میں شامل ہے۔"

پروفیسر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

''جاں نثار اختر کی طبیعت کسی صنف پر بند نہیں۔ ان میں اخذ و جذب کا مادہ حیرت انگیز حد تک موجود ہے ان کا ذہن طرح طرح کے اثرات کو قبول کرتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے طرح طرح کے رنگوں کو برت کر دیکھا ہے اور ہر صنف اور ہر رنگ میں شعر کہے ہیں... ایک ایسے شاعر کے ہاں جس کی عمر ساٹھ سے زیادہ ہو اور جو اپنی شعری پختگی کی منزلوں سے گزر چکا ہو کسی بنیادی تبدیلی کی توقع بہت کم کی جا سکتی ہے۔ جاں نثار اختر اس عمر کے شاید واحد شاعر ہیں جنھوں نے اپنی نئی غزل میں ایک واضح شعری انحراف کا پتہ دیا ہے۔ یہ بات عام طور پر دیکھی گئی ہے کہ شاعر کا ذہنی ارتقا مقبولیت حاصل کرنے یا ایک خاص منزل تک پہنچنے کے بعد رک سا جاتا ہے۔ جاں نثار اختر اس کلیے سے مستثنیٰ ہیں۔ خاص کر کامیاب نظم نگاری کر چکنے کے بعد ان کا نئی غزل کو اس والہانہ کیفیت سے سینے سے لگانا اس امر کا ثبوت ہے کہ انھیں اس بات کا بھی احساس ہے کہ ان کا نرم، رسیلا، اور حسیاتی اسلوب، ہم عصر آگہی اور جدید حسیت کا بڑی خوبی سے ساتھ دیتا ہے۔''

اردو کے مشہور و ممتاز ناقد اور شاعر پروفیسر جگن ناتھ آزاد جاں نثار اختر کی شاعری کے متعلق یوں فرماتے ہیں:

''جاں نثار کی آواز باقی شعرا کی آوازوں سے مختلف تھی، جو خاصیت شعر اس دور میں جاں نثار کو اپنے ہم عصر شعرا سے ممتاز کرتی ہے وہ ہے اس کے کلام میں عصری حیت کا شعور۔ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۵۵ء تک کی ترقی پسند شاعری میں عصری دور کی تصور کشی کی کوشش تو کی گئی ہے۔ لیکن اس شاعری میں بحیثیت مجموعی عصری حیت کا فقدان ہے۔ جاں نثار کی اس دور کی شاعری اس خلا کو بڑی حد تک پر کر رہی ہے۔''

''جاں نثار اختر کی شاعری کا دوسرا دور وہ ہے جس میں شاعر نے از سر نو اپنی دریافت کی ہے۔ ... اس دور میں شاعر کے تجربے کی وسعت، گہرائی اور گیرائی جس طرح جذبے میں تحلیل ہوئی ہے وہ ہماری اردو شاعری کا بالکل ہی ایک نیا اور اچھوتا باب ہے۔''

اردو کے مشہور و ممتاز نقاد شمس الرحمن فاروقی نے جاں نثار اختر کی نئی غزلوں اور ان کی رباعیوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے ایک مقام پر یوں لکھا ہے:

"نئی غزلوں کے جاں نثار اختر "گھر آنگن" کے جاں نثار اختر کو اس خیال سے ایک نہ سمجھنا چاہیے کہ دونوں میں روایتی جذبے کی جگہ ذاتی جذبے کا اظہار ہی "گھر آنگن" کہ شاعری اپنی تمام سادگی اور معصومیت اور بالغ گھریلو پن کے باوجود محدود اور اکہری شاعری ہے۔ اس میں مقامی استعارے کے سوا کوئی وسیع استعارہ یا زندگی کا کوئی پیچیدہ تجربہ نہیں ہے۔ اس کے برخلاف غزلوں میں مقامی استعارہ بہت کم ہے، اس کی جگہ وسیع تر استعارہ تلاش کرنے کی ایک مسلسل کوشش ہے۔"

پروفیسر عبدالقوی دسنوی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

"جاں نثار اختر ترقی پسند شاعروں کی اس جماعت سے تعلق رکھتے ہیں جس میں مجاز، مخدوم، جذبی، فیض سردار وغیرہ شامل تھے۔ لیکن ان کی آواز ان شعراء سے بہت کچھ مختلف رہی ہے۔ ان کے ہاں لہجے میں نرمی اور شگفتگی رہی ہے۔ تیزی اور پژمردگی نہیں رہی ہے۔ وہ عام فہم نکھرے، صاف ستھرے اور دل نشین تشبیہات، الفاظ تخیلات اور ترکیبات استعمال کرتے ہیں۔ ان کے بیان میں جلال نہیں۔ جمال کار فرما ہے۔ ان کی شاعری کی عام فضا دل کی دنیا ہے، آب و گل کی دنیا نہیں یعنی غم جاناں کا اثر ان کے یہاں غالب ہے غم دوراں کا کم کم البتہ یہ ضرور ہوا ہے کہ کبھی دل کی دنیا سے فرصت ملی اور دنیائے آب و گل کی سیر کرلی۔ تب ان کی شاعری کبھی پرچم بنتی ہے کبھی تلوار کی دھار کا کام کرنا چاہتی ہے۔ ظلم اور جبر کو دھتکارتے ہیں۔ مظلوم کی حمایت کرتے ہیں۔ مفلس اور مزدور کے درد کو اپنا درد بنالیتے ہیں۔ اور ان کے لئے فکر مند اور بے چین نظر آتے ہیں۔"

اردو کے نمائندہ اور معروف افسانہ نگار سہیل عظیم آبادی لکھتے ہیں:

"جاں نثار اختر میرے خاص دوستوں میں تھے اور آج بھی ہیں۔ ادھر ان کی شاعری میں جو نیا موڑ آیا ہے وہ مجھے بے حد پسند ہے۔ ان کی شاعری میں آج کے انسان کا

کرب صحیح طور پر ملتا ہے اور ان کی شاعری میں اس عہد کا صحیح شعور موجود ہے۔"

ڈاکٹر خلیق انجم تحریر کرتے ہیں:

"جاں نثار اختر کا خیال آتے ہی مندر میں جلتے ہوئے اس دیئے کا تصور ابھرتا ہے جس کی لو میں اندھیروں کو دور کرنے والا نور ہی نہیں، ایک بے نام تقدس بھی ہوتا ہے جس میں صرف روشنی ہی نہیں بلکہ روحانی سکون و طمانیت کا سامان بھی ہوتا ہے۔ اردو کو میں صرف ایک زبان نہیں بلکہ ایک کلچر بھی تسلیم کرتا ہوں۔ اور اس کلچر کی یادگار ہستیوں میں سے جتنے لوگوں سے نیاز حاصل ہے ان میں سے جاں نثار اختر کا نام سر فہرست ہے۔ اختر کو میں اردو کلچر کا سچا نمائندہ مانتا ہوں۔"

ڈاکٹر عنوان چشتی نے ایک مقالہ میں جاں نثار اختر کے گیتوں سے بحث کی ہے اور درج ذیل نتیجہ نکالا ہے:

"اردو گیتوں کے دائرے میں فکری گیت، وجدانی گیت اور جذباتی گیت شامل ہیں۔ جذباتی گیتوں میں "حسی گیت" "تخیلی گیت" اور صوفیانہ وجدانی گیت بھی شامل ہیں۔ جاں نثار اختر کے بیشتر گیت "حسی گیتوں کے دائرے میں شامل ہیں اگرچہ ان پر فلمی (Situation) کو ذہن میں رکھنا ضروری تھا یعنی ان پر خارجی پابندیاں شعوری تھیں۔ پھر بھی انھوں نے داخلیت کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا۔ ان کے گیتوں میں کبھی زندگی درد کے طوفان میں ڈوبتی ہے۔ کبھی محبوب کی یاد میں تصویریں سی بُن کر سطح ذہن پر رقص کرتی ہیں۔ کبھی درد سے روح کو آرام ملتا ہے۔ کبھی بھیگی چاندنی سینے میں آگ لگا دیتی ہے کبھی ٹھنڈی ہوائیں ناگن بن کر دل کو ڈستی ہیں اور جب بانہوں میں زندگی بھرنے کا امکان ہوتا ہے تو ان کے گیتوں میں پون ہنسنے اور سوج آنگن میں پگھلنے لگتا ہے۔ چاند پیار بن کر برسنے لگتا ہے۔ ان کے گیتوں میں ہجر و وصال کا کرب و کیف منظروں کا حسن اور کہیں کہیں حسن و عشق کی نفسیات کا عالم انھیں "حسی گیتوں کے دائرے میں شامل کرتا ہے"۔

فلمی دنیا کے مشہور و معروف شاعر کیفی اعظمی جو جاں نثار اختر کے ہم عصر

بھی ہیں انھوں نے اپنے خیالات اس طرح رقم کیے ہیں:

"جاں نثار اختر کی شاعری کمیت اور کیفیت ہر دو اعتبار سے اسکی مستحق ہے کہ ہماری تنقید اس کی طرف ایک سنجیدہ اور ذمہ دارانہ رویہ اختیار کرے اور ہمارے ادب میں اس کا صحیح مقام متعین کرے۔ میں اختر صاحب کا پہلے بھی مداح تھا اور آج بھی مداح ہوں۔ مجھے ان کی نئی غزلیں بھی پسند ہیں اور بہت سی پرانی نظمیں بھی۔ میں ان کے نئے لہجے کو ان کے پرانے لہجے کی ترقی سمجھتا ہوں انحراف نہیں۔"

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی یوں رقمطراز ہیں:

"جاں نثار اختر کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ذہن کے دریچوں کو نئی ہواؤں کی تازگی کے لئے کھلا رکھا ہے مگر اس کے مسموم اثرات کو داخل نہیں ہونے دیا ہے۔ انھوں نے کلاسیکی روایات کو سینے سے اس طرح لگا رکھا ہے جیسے کوئی اجداد کی صالح قدروں اور روایات کو حرز جاں خیال کرتا ہے۔"

اردو زبان کے مشہور و معروف جدید شاعر پرکاش فکری کا قول ہے:

"اختر صاحب اپنی حالیہ غزلوں کے ذریعہ ذہن و دل کے جتنے قریب آئے ہیں یہ حقیقت ہے کہ پہلے اتنے قریب نہ تھے۔ ان کی آنے والی غزلوں کی روشنی میں ان کی ساری شخصیت ایک عجیب سے (Glowing mist) کے دائرے سے نکل کر ہمارے ذہنوں میں اپنی جگہ بنا کر بیٹھ جاتی ہے۔

اختتامیہ

ترقی پسند شعرا میں جوش ملیح آبادی کے بعد جاں نثار اختر ہی تنہا شاعر ہیں جنھیں نظم و غزل دونوں پر بیک وقت قدرت کاملہ حاصل ہے، غزل گوئی تو انھیں ورثہ میں ملی ہے۔(جاں نثار اختر کے والد محترم مشہور و معروف غزل گو مضطر خیر آبادی تھے) البتہ نظم نگاری کا ذوق ان کے اندر ماحول کے اثر سے پیدا ہوا۔ جاں نثار اختر نے نظم و غزل دونوں میدان میں خاطر خواہ اضافے کیے ہیں۔ جنھیں ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ وہ شاعری کی تمام صنفوں پر طبع آزمائی بڑی کامیابی کے ساتھ کر چکے ہیں۔ مثلاً نظم، غزل، قطعہ، رباعی اور مثنوی وغیرہ۔ جاں نثار اختر سے ان کے بہت سے ہم عصر شعرا متاثر ہوئے ہیں۔ مثلاً مجاز لکھنوی کی نظم ''آوارہ'' اور جاں نثار اختر کی نظم ''بیزاری'' دونوں کا مطالعہ کرنے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ''آوارہ'' پر ''بیزاری'' کی گہری چھاپ ہے۔ اور اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ کہ مجاز نے یہ نظم جاں نثار اختر کی نظم سے ضرور متاثر ہو کر لکھی ہوگی۔ اس لئے کہ جاں نثار کی یہ نظم مجاز سے قبل کی تخلیق ہے۔

فیض احمد فیض کی ایک بے حد معروف غزل ہے ؎

تم آئے ہو نہ شب انتظار گزری ہے

فیض کی اس غزل سے قبل ردیف ''بار گزری ہے'' پر جاں نثار اختر پوری غزل کہہ چکے ہیں، اسی طرح علی سردار جعفری، معین احسن جذبی اور چند دوسرے معاصرین شعرا

کے یہاں اس قبیل کی مثالیں ملتی ہیں۔ علاوہ ازیں بعض شعرا ایسے ہیں جنھوں نے جاں نثار کا پورا پورا مصرع قدرے ترمیم و تخفیف کے ساتھ اپنا لیا ہے۔ اردو زبان و ادب کے لئے یہ نہایت افسوسناک امر ہے کہ اردو کا ایک اہم و ممتاز شاعر جس نے اردو شاعری کو نئے مزاج سے ہم آہنگ کیا، وسعتیں عطا کیں اور گلستان اردو شاعری میں قسم قسم کے گل بوٹے کھلائے ان کی خدمات کا اعتراف ان کے شایان شان محض اس وجہ کر نہیں کیا گیا کہ جاں نثار اختر فلمی دنیا کے شاعر تھے۔ حالانکہ انکی شاعری کے سارے سرمایے کو مد نظر رکھ کر ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ انھوں نے فلموں سے وابستگی کے باوجود اپنی شاعری کے اعلی ادبی معیار پر اخیر وقت تک بھی حرف آنے نہیں دیا۔ بلکہ فلمی گیتوں میں بھی اپنا انفرادی تشخص برقرار رکھا۔

جاں نثار اختر کی شاعری پر میری یہ کوشش حرف آخر نہیں کہی جاسکتی کیونکہ ان کے غیر مطبوعہ کلام و خطوط ضرور موجود ہوں گے۔ اور جب تک ان کے تمام غیر مطبوعہ کلام و خطوط شائع ہو کر منظر عام پر نہیں آجاتے۔ اس وقت تک ان کی شخصیت اور شاعری کے متعلق کوئی حتمی فیصلہ کرنا دشوار ہی نہیں ناممکن ہے۔ بلکہ میں تو اس بات کا قائل ہوں کہ ہر اچھے اور کامیاب فنکار کا فن اس لائق ہوتا ہے کہ وہ ہر دور میں تازہ رہتا ہے۔ اور عصری تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر عہد میں شاعر کے ایک ہی کلام کی تشریح علاحدہ علاحدہ کی جاتی ہے۔ اور اس کے مفہوم و معنی بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود کلام کے حسن، اثر اور تاثیر میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔

جاں نثار اختر نے کہا تھا ۔

کیا پتہ ہو بھی سکے اس کی تلافی کہ نہیں
شاعری تجھ کو گنوایا ہے بہت دن ہم نے

یہ کتاب دراصل اسی بات کی سعی ہے کہ جاں نثار اختر نے اس کی تلافی کی اور خوب کی۔ چنانچہ آج ان کا ہر قاری ان کے متعلق غالب کی زبان میں بہ تغیر ادنی یہ کہنے پر مجبور ہے کہ ۔

آج تم سا نہیں زمانے میں
شاعر مغز گوئے و خوش گفتار

ڈاکٹر اسلام عشرت کی تصانیف

۱۔ کلام حیدری	:	بحیثیت افسانہ نگار	۱۹۸۵ء
۲۔ خلیل الرحمن اعظمی	:	ترقی پسندی سے جدیدیت تک	۱۹۸۸ء
۳۔ جاں نثار اختر	:	شاعر جدید	۲۰۰۰ء

زیر طبع:۔

۴۔ فکشن نامہ

۵۔ احتسابِ فن

۶۔ زاویے اور جائزے

۷۔ باقیاتِ نظام